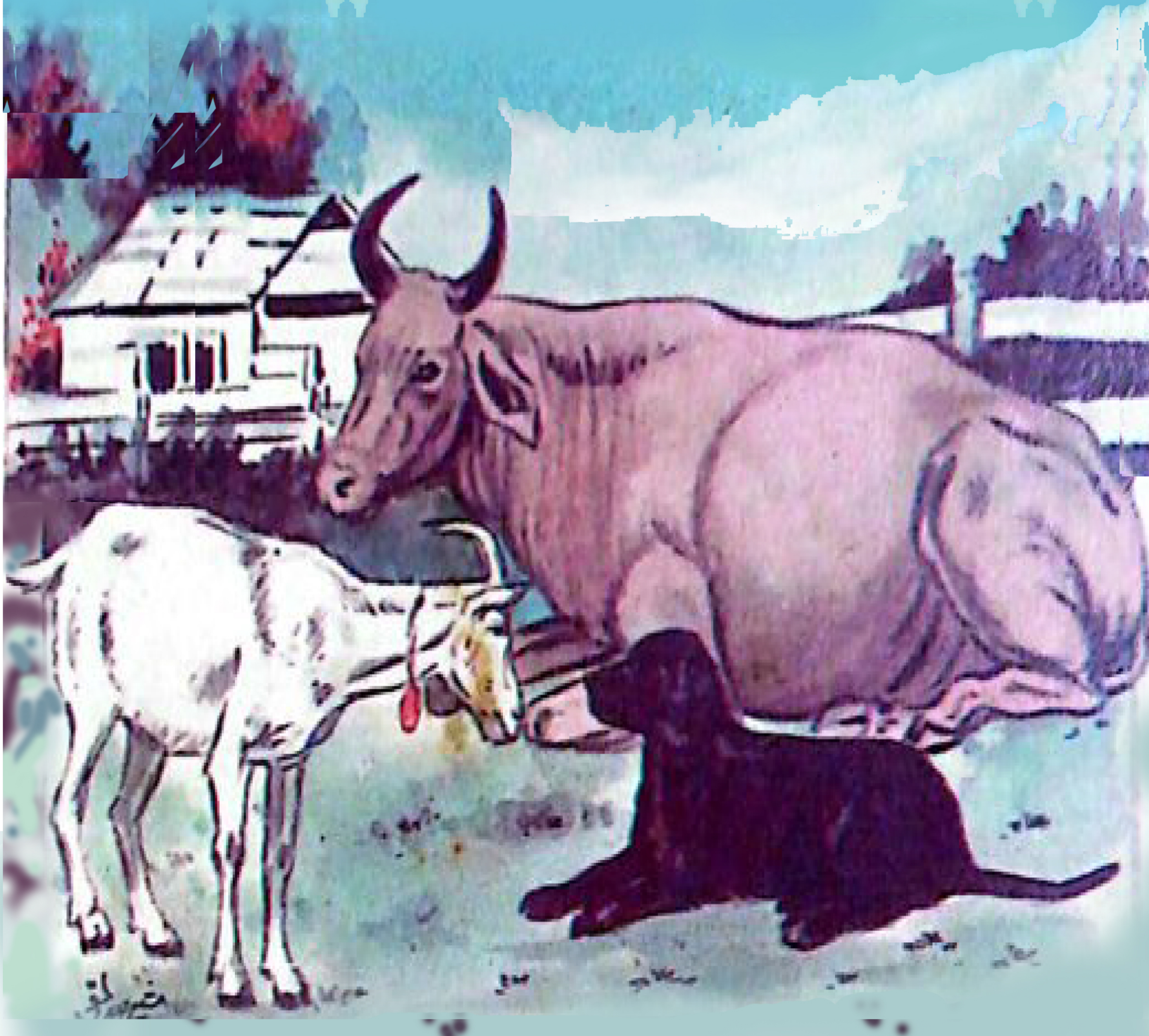
ماہ نامہ

ہمدرد نونہال

دسمبر ۱۹۸۷ء



نازک صاحب کا بکرا

رؤف پاریکھ



نازک صاحب ہمارے محلے میں رہتے تھے۔ نام تو ان کا اللہ جانے کیا تھا لیکن اپنی حرکتوں اور نخیلیے کی وجہ سے سارے محلے میں نازک صاحب کے نام سے مشہور تھے۔

دُبلے پتلے دھان پان آدمی تھے۔ پھونک مارو تو اُڑ جائیں۔ ذرا سی بات پر بگڑ جاتے تھے۔ جب وہ کوٹ پتلون پہنے، باریک سنہری کمانی کا چشمہ لگائے، ایک ہاتھ میں چھڑی اور دوسرے میں بکرے کی رسّی تھامے محلے میں نکلتے تھے تو ان کی دل چسپ حرکتوں کی وجہ سے راہ چلتے لوگ بھی رُک کر انھیں دیکھنے لگتے تھے۔ کبھی چھوٹے چھوٹے پتھروں پر پاؤں رکھنے سے انھیں موچ آجاتی اور کبھی اپنے بکرے کی مریَل سی "میں ایں" سن کر ڈر جاتے۔ ان کا بکرا بھی خوب تھا۔ موٹا تازہ کالے رنگ کا لیکن کان دونوں سفید۔

محلے میں نازک صاحب سے زیادہ ان کا بکرا مشہور تھا۔ نازک صاحب نے اسے بڑے پیار سے پالا تھا۔ کسی کی مجال نہیں تھی کہ ان کے بکرے کو ہاتھ بھی لگاتے۔ وہ اکثر اپنے بکرے کی عظمت، ذہانت اور اس کے اعلا خاندان کے قصے سنایا کرتے تھے۔ کہتے تھے کہ "اس سے ذہین، خوب صورت، بہادر اور شریف نسل کا بکرا آج تک پیدا نہ ہوا۔ اس بکرے کا پردادا مغل بادشاہوں کا پالتو اور شاہی بکرا تھا۔ اس کا دادا پنجاب کے سکھ حکم ران رنجیت سنگھ کے ہاں پلا بڑھا تھا۔ اس بکرے کی ماں دوسری جنگ عظیم میں انگریز فوجیوں کے ساتھ محاذ جنگ پر رہتی تھی اور انگریز فوجیوں نے کئی لڑائیاں صرف اس بکری کا دودھ پی پی کر جیتی تھیں۔"

اس پر کوئی بچّہ مذاقاً کہتا، "پھر تو اس کی ماں بکری کو بہادری کے صلے میں کوئی بڑا تمغا

بھی ملا ہو گا۔"

تو وہ بڑی سنجیدگی سے کہتے، "ہاں، ہاں، کیوں نہیں۔ اسے انگریز فوج کا سب سے بڑا تمغا وکٹوریا کراس ملا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ بکرا بھی بہت بہادر ہے۔ ایک دفعہ اس نے ڈاکوؤں کو مار بھگایا تھا۔"

حالانکہ وہ بکرا اتنا ڈرپوک تھا کہ بلّیاں بھی اسے ڈراتی تھیں۔ اسی لیے محلے کے بچّے کہا کرتے تھے: "نازک صاحب کا بکرا چوہا ہے چوہا۔" یہ سن کر نازک صاحب بہت خفا ہوتے تھے۔

بکرے کی اسی بزدلی نے اس دفعہ بقرعید پر عجب گُل کھلایا۔ آپ بھی سنیے:

کرنا اللہ کا یوں ہوا کہ دادی اماں نے ہمارے اباجان سے کہا کہ بقرعید قریب آ رہی ہے۔ قربانی کے لیے اچھا سا بکرا لے آؤ۔ اباجان عید سے دو روز پہلے ایک بکرا لے آئے۔ موٹا تازہ، سیاہ رنگ کا لیکن کان دونوں سفید۔ اس وقت تو ہم نے غور نہیں کیا لیکن بعد میں ہمیں احساس ہوا کہ یہ بکرا نازک صاحب کے بکرے سے بہت ملتا جلتا ہے۔ وہی رنگ وہی قد کاٹھ۔ خیر صاحب بکرا تو اباجان لے آئے لیکن وہ بکرا کیا تھا اچھا خاصا غنڈا تھا۔ کم بخت نے آتے ہی پڑوس کے بکرے کو ایسی ٹکّر ماری کہ بے چارہ لڑھکنیاں کھاتا ہوا دور جا گرا۔ پھر محلے کے دو چار آدمیوں کو سینگ مارے تو بے چارے بلبلا کر رہ گئے۔ بڑی مشکل سے پانچ چھے آدمیوں نے مل کر اسے رسّی سے باندھا۔ اس پر اس نے ایک ایسی خوف ناک آواز میں "میں" کی کہ بکرے تو بکرے ایک دفعہ تو محلے بھر کے بیل اور گائے بھی سہم کر رہ گئے۔ جو بچّے اس انتظار میں تھے کہ بکرا آئے گا تو اسے ٹہلانے لے جائیں گے وہ سب سانس روکے اپنی اپنی ماؤں کے پیچھے دبک گئے۔

"یا الٰہی، یہ بکرا ہے یا پہلوان، کسی کے قابو میں ہی نہیں آتا۔" امّی نے کہا۔

"اے بیٹا، یہ کیا اٹھا لائے ہو؟" دادی اماں ہمارے اباجان سے کہنے لگیں، "مجھے تو لگتا ہے یہ بکرا نہیں کوئی جن بھوت ہے۔"

"مجھے بھی یہی لگ رہا ہے۔" خالہ بی نے کہا۔

اباجان بولے، "کمال کرتے ہیں آپ لوگ بھی۔ بکرا ذرا طاقت ور ہے صحت مند ہے۔ بس بے چارہ نئے ماحول اور نئی جگہ سے گھبرا رہا ہے۔ کل تک ٹھیک ہو جائے گا۔"

لیکن کل تک اس "بے چارے" نے ایسی آفت مچائی کہ توبہ ہی بھلی۔ پہلے تو اس نے زور لگا

لگا کر رسّی توڑ دی اور باہر سڑک پر نکل بھاگا۔ راستے میں جو بکرا بھی اسے ملا اس سے الجھتا گیا اور ہر آنے جانے والے کو ٹکریں مارتا گیا۔ پورے محلے میں شور مچ گیا۔ لوگ دوڑ پڑے۔ کئی لوگوں نے اپنے بکرے گھر میں چھپا لیے۔ بڑی مشکل سے اسے قابو میں کر کے ایک کوٹھڑی میں بند کیا۔ اب محلے بھر میں اس کی دھاک بیٹھ چکی۔ لوگ اسے غنڈا بکرا کہنے لگے تھے۔ نازک صاحب نے جب اس بکرے کی شہرت سنی تو انھوں نے اپنے بکرے کو باہر نکالنا بند کر دیا۔ اور کہنے لگے، "اپنے نامعقول بکرے کو باندھ کر رکھنا۔ اگر وہ دوسرے بکروں کے ساتھ گھلا ملا تو اس کی بری صحبت میں پڑ کر سارے بکرے خراب ہو جائیں گے۔ بالکل اسی کی طرح سب بکرے شیطان ہو جائیں گے۔ اسی لیے میں نے اپنے بکرے کو باہر نکالنا بند کر دیا ہے۔ ہاں میاں! تمھارا کیا ہے۔ تمھارا بکرا تو دو تین دن میں کٹ جائے گا لیکن میں نے اپنا بکرا بڑی محنت سے پالا ہے۔ اس کی تربیت کی ہے۔ یہ کوئی کٹنے والا بکرا نہیں ہے۔ اس کا دادا پرچو تھا....."

"بس بس رہنے دیجیے۔ آپ کے لاڈلے بکرے کا شجرۂ نسب ہم خوب جانتے ہیں۔ اتنا کرم کیجیے گا کہ اسے دو تین دن باہر مت نکالیے گا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہمارا بکرا اس کی آنکھ وانکھ پھوڑ دے۔" یہ کہہ کر ہم اپنے بکرے کی خیریت دریافت کرنے اس کوٹھڑی کے اندر پہنچے جس میں موصوف بند تھے۔ معلوم ہوا کہ ٹکریں مار مار کر اس نے کوٹھڑی کے دروازے کی چولیں ڈھیلی کر دی ہیں۔ بڑی مشکل سے اسے گھاس اور پانی وغیرہ دیا۔ ہمارا خیال تھا کہ یہ غنڈا بکرا رات کو تھک ہار کر سو جائے گا۔ آخر سارا دن کشتی کرتا رہا ہے۔ لیکن توبہ کیجیے صاحب! وہ تو جانے کس مٹی کا بنا ہوا تھا۔ رات بھر کم بخت چلاّتا رہا۔ نہ سویا نہ سونے دیا۔ اس کی آواز سے نہ صرف گھر بھر کی نیند حرام تھی، بلکہ پاس پڑوس والے بھی تنگ آ چکے تھے۔ اتنی زوردار آواز میں "میں میں ایں" کرتا تھا کہ قبر میں پڑے مُردے بھی جاگ جائیں۔

آخر اللہ اللہ کر کے صبح ہوئی۔ محلے کے کئی لوگ ہمارے پاس بکرے کی شکایت کرنے آئے۔ ہم نے انھیں سمجھایا کہ ہم بھی بکرے سے اتنے ہی تنگ ہیں اور کل عید کی نماز پڑھ کر فوراً ہی اس کی میں میں کو ہمیشہ کے لیے بند کروا دیں گے۔

اور لوگوں کے ساتھ ساتھ نازک صاحب بھی شکایت کرنے پہنچ گئے۔ کہنے لگے، "آپ کے بکرے کی قوالی نے مجھے رات بھر نہیں سونے دیا۔ مجھے شبہ ہے کہ یہ بکرا پاگل تو نہیں۔ آخر میرا بھی تو

بکرا ہے۔ اتنے سالوں سے پالا ہوا ہے۔ مجال ہے جو کبھی زور سے "میں" بھی کی ہو۔ آخر میں نے اس کی تربیت کی ہے۔ بڑا خاندانی بکرا ہے میرا۔ اس بکرے کا پردادا....."

"مغلوں کا شاہی بکرا تھا"۔ ہم ان کی بات کاٹ کر بولے، "یہی کہنا چاہتے تھے نا آپ؟ صاحب، یقین کیجیے کہ ہم تو اپنے اس بکرے سے بہت تنگ آچکے ہیں۔ کل ہی قسائی کو بلوا کر چھری پھروا دیں گے۔ کہیے آپ کو اس کی بوٹیاں بھجوائیں یا پائے؟"

وہ دونوں کان پکڑ کر بولے، "نا۔ نا۔ توبہ توبہ! مجھے ہرگز کچھ نہ بھجوانا۔ اس کا گوشت کھا کر تو میں بھونکنے لگوں گا۔ اس غنڈے بکرے....."

اور وہ بہت دیر تک اللہ جانے ہمارے بکرے کو کیا کچھ کہتے رہے اور چلتے چلتے ہدایت کر گئے "دیکھو میاں! بکرا کٹواتے وقت بہت احتیاط کرنا۔ کہیں بھاگ نہ جائے۔ اور ہاں ایک قسائی سے کام نہیں چلے گا۔ بکرا جن ہے جن۔ کم از کم تین چار قسائیوں کی ضرورت ہوگی"۔

غرض وہ سارا دن محلے والوں کی شکایات اور ہدایات سننے میں گزرا۔ آخر رات آئی۔ رات کا چارا کھا کر بکرے نے تازہ دم ہو کر جو چلّانا شروع کیا صبح تک بغیر رُکے چلّاتا چلا گیا۔ صبح ہوتے ہی ہم نہا دھو کر عید کی نماز پڑھنے گئے۔ واپسی پر پپّو قسائی کو لیتے آئے۔ ہم نے اس سے بتیرا کہا کہ بکرا بڑا منھ زور ہے، دو چار آدمیوں کو بھی ساتھ لے لو لیکن وہ نہ مانا۔ کہنے لگا، "برسوں سے بکرے کاٹ رہا ہوں۔ چھوٹے موٹے بکرے کو اگر گھور کر دیکھ لوں تو اس کا دم نکل جاتا ہے۔ اور کوئی بکرا ذرا تگڑا ہو تو ہش کرنے پر دُم دبا کر لیٹ جاتا ہے اور میں مزے سے چھری پھیر دیتا ہوں"۔

لیکن پپو قسائی کی ساری شیخی دھری کی دھری رہ گئی۔ بکرے کو کوٹھڑی سے نکالنا تھا کہ اس نے اُچھل کر پپو قسائی کو ٹکّر ماری اور اس سے پہلے کہ قسائی اٹھ کر اسے "ہش" کرتا، بکرا چھلانگیں مارتا ہوا دروازے سے باہر نکل گیا۔ ہم شور کرتے ہوئے اس کے پیچھے بھاگے۔ ابّا جان نے پپو قسائی کو سہارا دے کر کھڑا کیا اور وہ بھی بڑے غصّے سے چھری لہراتا ہوا بکرے کے پیچھے بھاگا۔

ادھر بکرا آن کی آن میں برابر کی گلی میں گھس گیا اور نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ ہم ٹامک ٹوئیاں مارتے رہے لیکن بکرا نہ ملا۔ پورے محلے میں شور مچ گیا کہ غنڈا بکرا فرار ہو گیا ہے۔ بچے تماشا دیکھنے باہر نکل آئے۔ آخر کسی بچے نے بتایا کہ برابر کے محلے میں ایک بکرا دوسرے بکروں کو ٹکریں مارتا دیکھا گیا ہے۔ ہم نے کہا ہو نہ ہو یہ ہمارا ہی بکرا ہے۔ برابر کے محلے میں پہنچے مگر وہاں بھی بکرا نہ ملا۔

جب مایوس ہو کر واپس آ رہے تھے تو پپو قسائی ایک موٹے تازے کالے بکرے کا سفید کان پکڑے آتا دکھائی دیا اور وہ بکرا بڑی شرافت سے سر جھکائے آہستہ آہستہ اس کے ساتھ ساتھ چلا آ رہا تھا۔ ہمیں اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا کہ ہمارا بکرا اتنی آسانی سے قابو کیا جا سکتا ہے۔ ہم مارے حیرت کے اپنی جگہ پر کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔ واقعی پپو قسائی نے تو کمال کر دیا۔ وہ ٹھیک کہتا تھا کہ بکرے میری 'ہش' سن کر ڈر جاتے ہیں۔ ہم دل ہی دل میں یہ سوچ رہے تھے اور ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے پپو قسائی بکرے کو کان سے پکڑ کر ہمارے گھر میں داخل ہو گیا تاکہ اسے ذبح کر سکے۔

اتنے میں ہمیں ایک خوف ناک "میں ایں" سنائی دی۔ ہم اچھل پڑے اور پیچھے مڑ کر دیکھا تو غنڈا بکرا کھڑا ہمیں غصے سے گھور رہا تھا۔ "میرے اللہ! یہ یہاں کہاں سے آ گیا؟ تو پھر پپو قسائی کون سے بکرے کو کاٹنے لے گیا ہے؟" ہم سوچ میں پڑ گئے۔ لیکن غنڈے بکرے نے ایک بار پھر زور سے "میں ایں" کی۔ اس کے ساتھ ہی نازک صاحب آتے دکھائی دیے۔ بہت بدحواس نظر آتے تھے۔ ہمیں دیکھ کر لپک کر آگے آئے اور پھولی ہوئی سانس سے بولے، "تم نے میرے بکرے کو کہیں دیکھا ہے؟ اللہ جانے کس طرح کھلا رہ گیا تھا گھر سے باہر نکل گیا۔ اور یہ تمھارا بکرا باہر کیوں کھڑا ہے؟" اب ہماری سمجھ میں آیا کہ پپو قسائی نے اتنی آسانی سے بکرے کو کیوں قابو کر لیا تھا۔ دراصل وہ نازک صاحب کا بکرا تھا۔ دونوں کا رنگ اور جسامت ایک ہی تھی اس لیے دھوکا ہو گیا۔ یہ خیال آتے ہی ہم گھر کی طرف دوڑ پڑے تاکہ پپو قسائی کو بکرا کاٹنے سے باز رکھ سکیں۔

"ٹھیرو۔ رک جاؤ۔ بکرا مت کاٹنا..... بکرا مت کاٹنا..... یہ بکرا ہمارا نہیں ہے۔" یہ کہتے ہوئے ہم گھر میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ پپو قسائی نازک صاحب کے بکرے کو کاٹ چکا تھا اور اس کی کھال اتارنے کی تیاری کر رہا تھا۔

ابا جان حیرانی سے ہماری شکل دیکھ رہے تھے اور ہم یہ سوچ رہے تھے کہ نازک صاحب کو ہم یہ سارا معاملہ کیسے سمجھائیں گے۔ وہ تو ہماری جان کو آجائیں گے۔ اتنے میں نازک صاحب ہمارے گھر میں داخل ہوئے اور ابا جان کو مخاطب کر کے بولے، "آپ نے میرا بکرا کہیں دیکھا ہے۔ نہ جانے کس طرح کھلا رہ گیا تھا۔ گھر سے باہر نکل گیا۔ کیا آپ کا بکرا کٹ گیا؟"

اس سے پہلے کہ ابا جان کچھ کہتے ہم بول پڑے، "جی ہاں جی ہاں ہمارا بکرا کٹ گیا، بڑے آرام اور شرافت سے۔ کم بخت بڑا ڈرپوک نکلا۔ ذرا مزاحمت نہیں کی۔ آپ کے بکرے کی طرح بہادر ہوتا

اور شاہی بکروں کی اولاد ہوتا تو ہرگز اس طرح نہیں کٹتا۔ آخر آپ کا بکرا ڈاکوؤں کا مقابلہ کرنے والا بکرا ہے بھلا اُس کا اور اِس کا کیا مقابلہ؟"

وہ خوش ہو کر بولے، "جی، جی، صحیح کہا تم نے برخوردار۔ لیکن میرا بکرا ہے کہاں؟" "میں نے باہر کھڑا دیکھا تھا ابھی۔ بڑی خوف ناک آواز میں "میں" کر رہا تھا۔ آخر اس کی ماں نے دوسری جنگِ عظیم لڑی تھی۔" ہم نے کہا

اب ان کی سمجھ میں سارا معاملہ آگیا۔ کبھی وہ اپنے بکرے کو دیکھتے جس کی کھال پپو قسائی اتار رہا تھا اور کبھی اس غنڈے بکرے کو جو باہر کھڑا چلا رہا تھا۔ ہم نے جھانک کر باہر دیکھا۔ محلے بھر کے بچے ایک بڑا سا دائرہ بنائے غنڈے بکرے کو دیکھ رہے تھے اور وہ بڑے غصّے سے ان کے درمیان کھڑا شور مچا رہا تھا۔ "یہ رہا آپ کا بکرا۔" ہم نے نازک صاحب کو انگلی کے اشارے سے غنڈا بکرا دکھا کر کہا۔

لیکن نازک صاحب نے تو ایک ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ "میرا بکرا میرا بکرا" کہہ کر انھوں نے سارے محلے والوں کو اکھٹا کر لیا۔ ہم نے انھیں پیش کش کی کہ اپنے بکرے کے عوض آپ ہمارا بکرا لے لیں لیکن وہ راضی نہ ہوتے تھے، کہتے تھے اتنا خوب صورت، ذہین اور بہادر بکرا اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا اور یہ بکرا تو غنڈا ہے۔ میں اسے کیسے لے سکتا ہوں۔ آخر لوگوں نے انھیں سمجھایا کہ ایک سا رنگ اور قد ہونے کی وجہ سے پپو قسائی سے غلطی ہو گئی ہے۔ آپ دوسرا بکرا لے لیں۔ ابا جان نے بھی ان سے معافی مانگی۔

آخر وہ راضی ہو گئے لیکن انھوں نے اسی وقت کھڑے کھڑے پپو قسائی کو وہ بدمعاش بکرا فروخت کر دیا۔ اور پپو قسائی تین چار آدمیوں کی مدد سے اسے لے گیا۔

آج بھی نازک صاحب اس بکرے کو یاد کر کے اداس ہو جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اتنا ذہین، خوب صورت، بہادر اور طاقت ور بکرا آج تک دنیا میں پیدا نہیں ہوا۔ حال آنکہ وہ بکرا ذرا سا بھی بہادر ہوتا اور پپو قسائی سے تھوڑی بھی زور آزمائی کر لیتا تو شاید کٹنے سے بچ جاتا۔ لیکن نازک صاحب اس بات کو نہیں مانتے۔ کہتے ہیں کہ "اس بکرے کا پردادا مغل بادشاہوں کا پالتو اور شاہی بکرا تھا۔ اس کا دادا......"

بے وفا کون؟

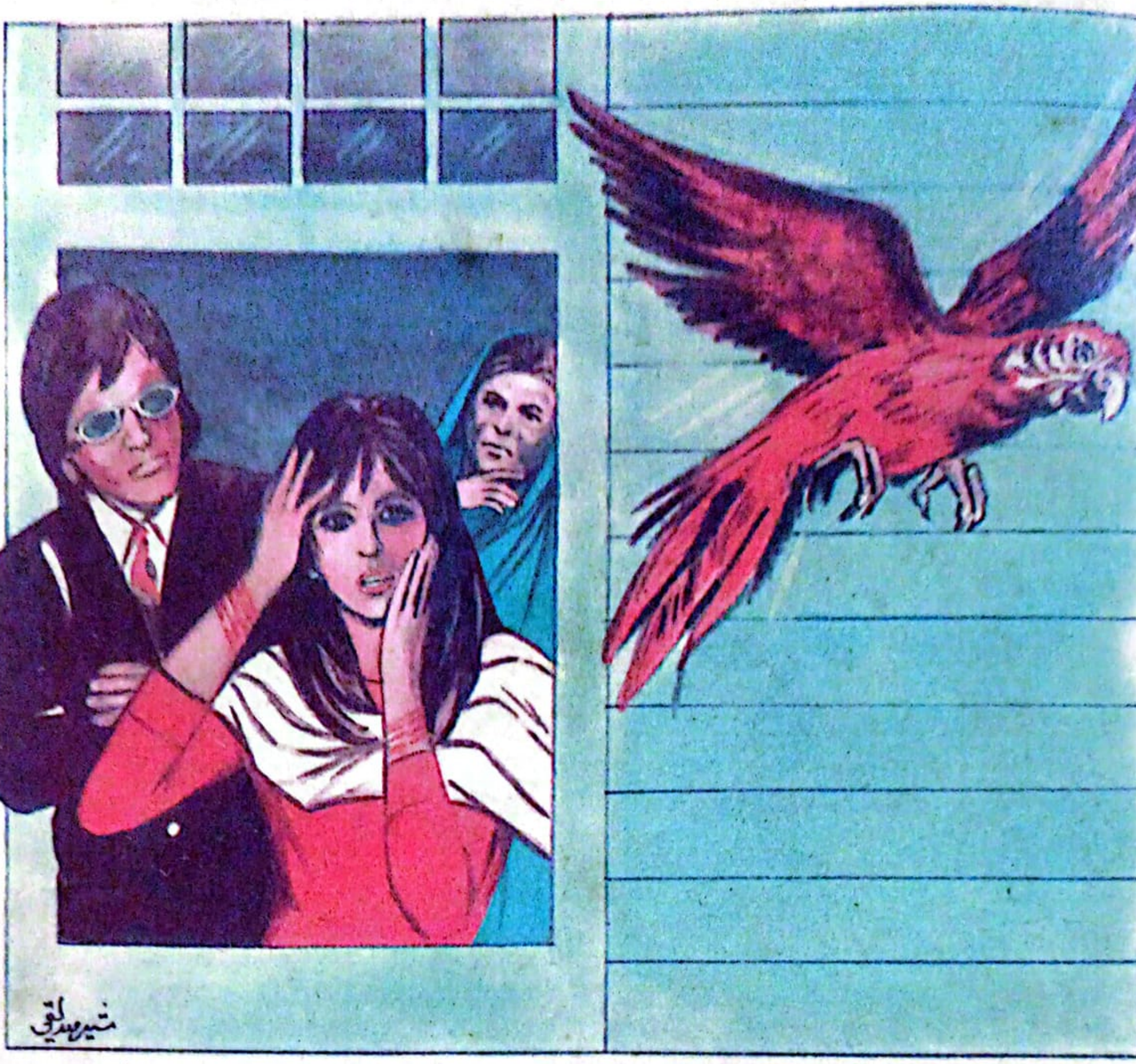
مونا کنول

سارا گھر خوشیاں منانے میں مصروف تھا۔ گانے گائے جا رہے تھے۔ لڑکیاں لہک لہک کر گا رہی تھیں۔ انھی لڑکیوں میں اِرم بھی شامل تھی۔ اُس نے ہلکے پیلے رنگ کے کپڑے پہن رکھے تھے۔ آج اِرم کی بڑی باجی کو مایوں بٹھایا جا رہا تھا۔ ان کی دو تین دن کے بعد شادی ہونے والی تھی۔ آج اِرم ہم دونوں کو بالکل بھول گئی۔ وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ شادی بیاہ کے گیت گانے میں مصروف تھی۔ اِرم نے آج ہمیں دانہ بھی نہیں ڈالا نہ پینے کے لیے پانی دیا۔ ہم دونوں تقریباً صبح ہی سے بھوکے تھے۔ پہلے ہم نے اپنی زبان میں "ٹیں ٹیں" کر کے اِرم کو بہت آوازیں دیں مگر ارم تک شاید ہماری آواز نہیں پہنچ پائی۔ سب لڑکیاں عورتیں اور بچے رنگ برنگے لباس پہنے ہوئے اِدھر سے اُدھر آ جا رہے تھے۔ سب ہی خوش تھے، لیکن ہمیں ڈر تھا کہ ہم کسی کے پاؤں تلے نہ آ جائیں۔ پھر ہم ایک کرسی کے نیچے ایک پائپ پر بیٹھ گئے۔ کئی بار اِرم ہمارے نزدیک سے گزری بھی مگر اس کی ہم پر نظر نہیں پڑ پائی۔ ہم نے "ٹیں ٹیں" کر کے اُسے اپنی طرف مخاطب کرنا چاہا تو وہ ہمیں دیکھتی ہی نہیں تھی۔ گھر میں موجود ڈھیر سارے مہمانوں کے شور میں ہم دو ننھے مُنّے پرندے کس طرح نظر آ سکتے تھے۔ اور اگر وہ ہمیں اِدھر اُدھر ڈھونڈنے کی کوشش بھی کرتی، تو کوئی نہ کوئی اُسے بُلا لیتا اور وہ پھر ہمیں بھول جاتی۔

ہمارے حلق میں پیاس کی وجہ سے کانٹے پڑنے لگے۔ مجھے اچانک ہی وہ دن یاد آ گیا جب ارم کے بھائی جان ہم دونوں کو بڑے پیار سے بازار سے خرید کر لائے تھے۔ اور پھر اِرم نے کتنے پیار سے ہماری دیکھ بھال کی تھی۔ جب ہم بڑے ہو گئے تو پھر بھی اِرم ہمارا بے حد خیال رکھتی۔ ہم دونوں کو روزانہ نہلاتی، جس سے ہمارا رنگ اور

نِکھر آتا، ہماری مُرغ چونچوں میں شادابی سی آجاتی۔ اِرم کے روزانہ نہلانے سے ہم تروتازہ رہتے۔ ہم سوچتے کہ اِرم ہمارے لیے اِتنا کچھ کرتی ہے مگر ہم ارم کے لیے کچھ نہیں کر پاتے۔ مگر آج اِرم نے ہم کو نہ کچھ کھانے پینے کو دیا اور نہ نہلایا۔ ابھی میں یہ سب باتیں سوچ ہی رہا تھا کہ کھانا لگنے لگا۔ لوگ اس طرح شور کرنے لگے جیسے وہ ہم سے بھی زیادہ بھوکے ہوں۔ چاولوں کی خوشبو سے ہمارے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا۔ ہم دونوں نے فیصلہ کیا کہ کیوں نہ چل کر دیکھا جائے۔ شاید زمین پر کچھ چاول کے دانے ہی پڑے ہوئے مل جائیں۔ اسی سے پیٹ بھر لیں گے۔ ابھی ہم اِرم کے کمرے کے پاس سے ہوتے ہوئے صحن میں پہنچے ہی ہوں گے کہ اِرم کے بھائی جان نے اور ایک لڑکے نے ہمیں دیکھے بغیر گرم گرم چاولوں کی دیگ زمین پر رکھ دی۔ میں اپنے ساتھی سے ذرا فاصلے پر تھا۔ وہ آگے تھا اس لیے دیگ کے نیچے آگیا۔ اس کی ایک دردناک چیخ نِکلی۔ مگر ان مہمانوں کے شور میں وہ بھی دب گئی اور اس کی رُوح پرواز کر گئی۔

میرا ساتھی مجھ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بچھڑ گیا تھا۔ میں نے چیخ چیخ کر اِرم کے بھائی جان سے اِلتجا کی۔ مگر انھوں نے مصنوعی پیار بھرے لہجے میں "مِٹھو، مِٹھو بیٹے" کہتے ہوئے مجھے اپنے ہاتھ پر بٹھا کر واپس اسی کرسی پر بٹھا دیا جس پر ہم دونوں پہلے بیٹھے تھے۔ جب ارم کے بھائی جان مجھے کرسی کے پائپ پر بٹھا رہے تھے تو میں نے غصّے میں ان کے کاٹ لیا۔ وہ مجھے بُرا بھلا کہتے ہوئے چلے گئے۔ مجھے اُن کی محبت کا احساس تھا مگر مجھے اپنا ساتھی بہت یاد آرہا تھا۔ میرا دِل چاہ رہا تھا کہ میں بھی کسی گرم گرم دیگ کے نیچے آکر مر جاؤں۔ میں نے صحن میں جاکر چاہا کہ کسی دیگ کے نیچے آجاؤں مگر وہاں پر صرف وہی دیگ رکھی تھی، جس کے نیچے میرا ساتھی تھا۔ مجھ میں اتنی طاقت ہوتی تو شاید میں دیگ کو ہٹا کر اپنے دوست کی جان بچا لیتا مگر یہ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ آخر میں واپس کرسی کے نیچے آکر بیٹھ گیا اور اپنے پیارے ساتھی کے بارے میں سوچنے لگا کہ ہم دونوں ساتھ پلے بڑھے۔ ہم میں بڑی محبت تھی۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ کہیں دور اُڑ جاؤں مگر میرے پَر ابھی اتنے بڑے نہیں ہوئے تھے۔ ان لوگوں نے اسی ڈر سے میرے



پَر کاٹ دیے تھے لیکن مجھے پورا یقین تھا کہ تین دن میں یا چار دن میں میرے پَر بڑے بڑے ہو جائیں گے۔ پھر میں دُور کہیں اُڑ جاؤں گا۔ ابھی میں یہ سب کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ اِرم آتی دکھائی دی۔ خوشی سے میری باچھیں کِھل گئیں .... مگر .... مجھے فوراً ہی خیال آیا کہ اب کیا فائدہ۔ اب تو میرا ساتھی مجھ سے بچھڑ چکا ہے۔

ارم نے ایک کٹوری میں چاول دیے اور ایک میں پانی لا کر میرے آگے رکھا۔ میں نے جلدی جلدی چاول کھانے شروع کر دیے۔ اچانک ارم نے میرے ساتھی کے بارے میں پوچھا۔ میں نے اپنی زبان میں ارم کو بتانا چاہا مگر افسوس ارم کچھ سمجھ نہ پائی۔ جیسے ہی مجھے اپنے پیارے ساتھی کا خیال آیا میں نے چاول کھانے چھوڑ دیے اور تھوڑا سا پانی پی کر اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔

آج دوسرا دن تھا۔ ارم اپنی باجی کے پاس اپنی سہیلیوں کے ساتھ ان کے کمرے میں تھی۔ مجھے جب بھوک لگی تو میں نے وہی باسی چاول کھانے میں عافیت سمجھی۔ آج شام بھی بڑے مہمان آئے، گھر میں بڑے گانے گائے گئے۔ اللہ اللہ کر کے ارم کی باجی کی شادی ہو ہی گئی اور وہ اس گھر سے رخصت ہو ہی گئیں۔ ارم نے آج مجھے اتنے دنوں بعد دیکھا تھا۔ ارم نے دیکھا کہ میرے پاس وہی باسی چاول رکھے ہیں، اور وہ پانی بھی پہلے والے دن کا رکھا تھا اور بہت گندا ہو گیا تھا۔ ارم نے میرے ساتھی کو بہت تلاش کیا مگر وہ بے چارہ کہاں سے ملتا۔ وہ تو شاید اس گرم گرم دیگ کے نیچے ہی راکھ بن گیا ہوگا۔

ابھی ارم میرے ساتھی کے بارے میں افسوس کر رہی تھی کہ اس کی امّی بولیں:

"کہیں اُڑ گیا ہو گا۔ پرندے اور جانور ہوتے ہی بے وفا ہیں۔ بتاؤ اتنا پیار دیا ارم نے اس توتے کو مگر جیسے ہی موقع ملا اُڑ گیا۔" ارم کے بھائی جان جو پاس ہی بیٹھے تھے بولے، "جاؤ ارم! قینچی لے آؤ۔ اس کے پَر کاٹ دوں ورنہ یہ بھی اُڑ جائے گا۔"

جی ہاں! میرے پَر واقعی بڑھ گئے تھے۔ مجھے پہلے ہی سے اس بات کا یقین تھا۔ ارم اُٹھ کر قینچی لینے کے لیے چلی گئی۔ میں نے اس گھر میں مزید ٹھیرنا مناسب نہ سمجھا، کیوں کہ اس گھر میں ہمیں پیار تو ملا مگر درد بھرا۔ وہاں ایک کھڑکی تھی جو اتفاق سے اس وقت کھلی ہوئی تھی۔ میں فوراً اس کھڑکی میں سے نکل کر اُڑ گیا۔

کیا آپ کو معلوم ہے؟

- سی۔ آئی۔ ڈی (C.I.D.) مخفف ہے سنٹرل انویسٹی گیشن ڈپارٹمنٹ کا۔
- ایف۔ آئی۔ اے (F.IA.) فیڈرل انویسٹی گیشن ایجنسی کا مخفف ہے۔
- اقوامِ متحدہ کے ایک ذیلی ادارے یونیسکو (UNESCO) کا پورا نام ہے۔ یونائیٹڈ نیشنز ایجوکیشنل سائنٹیفک اینڈ کلچرل آرگنائزیشن۔
- سفارت کی تمام گاڑیوں پر رجسٹریشن کی تختیوں پر لفظ سی۔ ڈی (C.D.) لکھا ہوتا ہے۔ اس کا مطلب ہے کور اوف ڈپلومیٹس۔

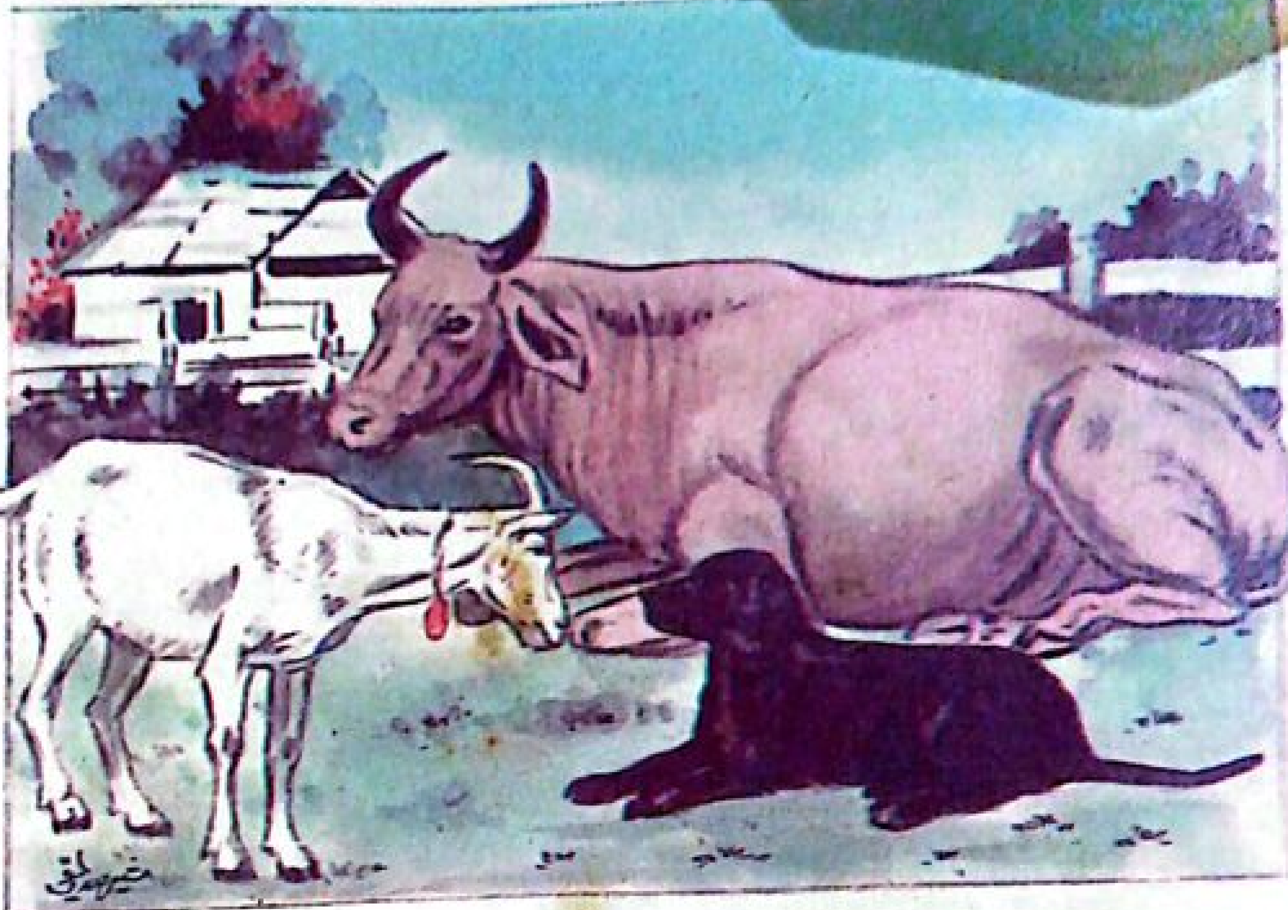


ہارسنگھار کی خواہش

فاطمہ افشاں، کراچی

ایک جنگل میں بہت سے پیڑ پودے تھے۔ ظاہر ہے جنگل میں ان کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ پھر بھی یہ پیڑ پودے سورج کی گرمی، ہَوا اور بارش کی وجہ سے بڑھتے اور پھلتے پھولتے رہتے تھے۔ پیڑوں پر توتوں نے اپنے گھونسلے بنا رکھے تھے۔ پیڑوں کے سائے میں اس راستے سے گزرنے والے مسافر آرام کرتے تھے۔ مسافر درخت کے پھل کھا کر اپنی بھوک مٹاتے تھے۔ اس جنگل میں برگد کے ایک بہت پرانے اور بڑے پیڑ کے پاس ہارسنگھار کا ایک چھوٹا سا پیڑ تھا۔ بارش ہونے کے بعد وہ ہرا بھرا ہو جاتا اور اس کی

شاخیں پھولوں سے لد جاتیں اور گرمیوں میں اس کے سارے پتّے جھڑ جاتے اور وہ ٹھنٹھ کھڑا رہ جاتا۔ اس وجہ سے ہار سنگھار کا پیڑ بہت دُکھی رہتا تھا۔ جنگل سے گزرنے والے مسافر برگد کے سائے میں بیٹھ کر اپنی تھکن دُور کرتے تھے۔ آم اور جامن وغیرہ کے پھلوں کو کھا کر خوش ہوتے، مگر ہار سنگھار کا پیڑ نہ تو کسی کے لیے سایہ کر سکتا تھا اور نہ کسی کو پھل دے سکتا تھا۔ ایک دن ہار سنگھار نے اپنے دِل میں سوچا کہ اگر میرے پتّے سونے کے ہوتے تو کتنا اچھّا ہوتا۔ میں سب سے خوب صورت معلوم ہوتا۔ صُبح وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس کے پتّے سونے کے ہوگئے۔ یہ دیکھ کر اس نے سب درختوں کو دیکھا اور کہا، "میں کتنا اچھا لگ رہا ہوں۔ سب ہی درخت میرے سامنے پھیکے پڑ گئے ہیں۔ یہ ہرے ہرے پتّے میرے سامنے کتنے بھدّے لگ رہے ہیں"۔ مگر اس کی خوشی تھوڑی ہی دیر میں ختم ہوگئی۔ اس راستے سے گزرنے والے ایک لڑکے نے سونے کے پتّے دیکھے تو اس کی باچھیں کِھل گئیں۔ اس نے سارے پتّے توڑ کر اپنے تھیلے میں بھر لیے اور خُوشی خوشی چلا گیا۔ ہار سنگھار کا پیڑ پھر ٹھنٹھ ہوگیا۔ وہ اپنی اس حالت پر بہت اُداس ہوا۔ اس نے اس بار یہ سوچا کہ اگر میرے پتّے شیشے کے ہوتے تو کتنا اچھّا ہوتا۔ انھیں کوئی نہیں توڑتا اور میں سب سے اچھا لگتا۔ دوسرے دن صبح ہوتے ہی اس نے دیکھا کہ وہ شیشے کے پتّوں سے لدا ہُوا ہے۔ سورج کی روشنی پڑنے سے وہ پتّے سات رنگ کی روشنی دینے لگے۔ وہ اپنے چمکتے ہوئے پتّوں کو دیکھ کر بہت خوش ہُوا اور سوچنے لگا کہ اب انھیں کوئی نہیں توڑے گا۔ میں دوسرے پیڑوں سے بہت خُوب صورت لگوں گا۔ مگر شام کے وقت ہوا کا زور دار جھکڑ چلا اور شیشے کے پتّے ایک دوسرے سے ٹکرا کر ٹوٹ گئے۔ ہار سنگھار پھر ٹھنٹھ ہوگیا۔ اس نے دل میں سوچا، "اس سے اچھا تو میں پہلے تھا۔ نہ کوئی مجھے توڑتا تھا اور نہ ہوا چلنے سے میرے پتّے ٹوٹتے تھے"۔ یہ سوچ کر وہ پہلے کی طرح ہرا ہوگیا۔ وہ اب بہت خُوش تھا۔ وہ جان گیا تھا کہ اللّٰہ تعالیٰ نے جو کچھ ہمیں دیا ہے اسی میں خوش رہنا چاہیے۔



جاڑے کی ایک رات

علی اسد

کسی زمانے میں اسپین میں ایک بکری رہا کرتی تھی۔ اس کا نام تھا "بونیٹا"۔ اسپینی زبان میں اس لفظ کے معنی ہیں۔ "خوب صورت" اور واقعی بونیٹا بہت خوب صورت تھی۔ اس کے سفید چکنے چکنے بال تھے اور بڑی بڑی بھوری آنکھیں تھیں۔ جب بھی کسی طرف سے گزرتی تو لوگ گھوم گھوم کر اس کو دیکھنے لگتے تھے۔ وہ اپنے سر کو اٹھا کر بڑی شان سے چلتی تھی۔ وہ اکثر سوچا کرتی تھی: "میں خوب صورت تو ہوں اور لوگ میری تعریفیں بھی کرتے ہیں مگر مجھے ہر وقت پریشانی ہی رہتی ہے۔"

ایک کتا اس کا دوست تھا جس کا نام سوئفٹ تھا۔ اور ایک گائے اس کی سہیلی تھی۔ اس کا نام روسیٹ تھا۔ یہ دونوں بونیٹا کی حالت کو نہیں سمجھتے تھے۔ کبھی کبھی سوئفٹ پوچھتا، "بونیٹا! کیا بات ہے؟ تم کو کھانے کو بھی خوب ملتا ہے اور رہنے کے لیے آرام دہ جگہ بھی موجود

ہے جہاں تم سردی سے محفوظ ہو۔ مگر تم خوش کیوں نظر نہیں آتیں؟"

سوئفٹ جب اس طرح پوچھتا تو روسیٹ ذرا دیر کے لیے جگالی کرنی بند کر دیتی اور بونیٹا سے کہتی، "م۔م۔ ما۔ لے ہاں! اس کے علاوہ تم کو اور کیا چاہیے"۔ اتنا کہہ کر وہ پھر اپنی جگالی شروع کر دیتی۔ بونیٹا نے بے پروائی سے کہا، "ممکن ہے تمھارے لیے یہ کافی ہوں۔ مگر مجھے تو اور بھی بہت سی چیزیں چاہییں۔"

"کون سی چیزیں؟" سوئفٹ نے پوچھا۔

بونیٹا نے جواب دیا، "ارے دیکھو نا۔ یہ جو میری گردن میں رسی بندھی ہے میں اس سے نجات حاصل کرنا چاہتی ہوں۔ اور آزادی سے گھومنا چاہتی ہوں۔ میں دنیا کی سیر کرنا چاہتی ہوں ۔۔۔۔" وہ اچانک خاموش ہو گئی۔ کیوں کہ اس کے دوستوں نے اس کی باتوں پر زیادہ توجہ نہ کی۔

بونیٹا، روسیٹ اور سوئفٹ تینوں انٹونیو کے فارم پر رہا کرتے تھے۔ اس فارم کے ایک طرف ایک چھوٹی سی ندی تھی اور دوسری طرف ریلوے لائن تھی۔ فارم چھوٹا تو تھا، مگر خوب صورت بہت تھا۔ اس میں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ انٹونیو اکیلا رہا کرتا تھا مگر اس کی اسے کوئی پروا نہ تھی، کیوں کہ اسے اپنے فارم پر بہت سے کام کرنے ہوتے تھے۔ اسے تنہائی کا احساس ہوتا ہی نہیں تھا۔

ان دنوں جاڑے کا موسم تھا۔ بونیٹا کی کوفت میں اضافہ ہو گیا تھا۔ گرمی کے موسم میں وہ گھاس میں دن بھر کھیلتی رہتی تھی۔ مگر اب سردی اور بارش کی وجہ سے انٹونیو اسے اصطبل میں بند رکھتا تھا۔ دن بھر وہ ایک چھوٹی سی کھڑکی میں سے باہر کی طرف دیکھتی رہتی تھی اور دل ہی دل میں کڑھتی رہتی تھی۔

آخر کار اس کی الجھن اتنی بڑھ گئی کہ اس نے بھاگ جانے کی ٹھان لی۔ اپنے دوستوں اور فارم کو چھوڑنے کا اسے افسوس ہو رہا تھا مگر ایک ہی جگہ بند رہنے کی وجہ سے وہ اکتا گئی تھی۔ چناں چہ وہ رات کا انتظار کرنے لگی اور جب انٹونیو اپنے کتے سوئفٹ کو لے کر گھر چلا گیا اور روسیٹ اپنی جگالی میں مصروف ہو گئی تو اس نے گردن پر بندھی ہوئی رسی پر زور لگانا شروع کر دیا۔ آخر رسی ٹوٹ گئی اور وہ آزاد ہو گئی۔

اب وہ آزاد تھی اور ایک نئی زندگی شروع کر سکتی تھی۔ وہ آزادی کی خوشی اور سردی کی

وجہ سے کانپنے لگی۔ چاروں طرف اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ اندھیرا محض رات کی وجہ سے نہ تھا، بلکہ آسمان پر کالے کالے بادل بھی چھائے ہوئے تھے۔

اس بھیانک رات کو دیکھ کر... اسے ایک لمحے کو جھرجھری سی آگئی مگر ہمت کر کے اس نے قدم بڑھایا۔ وہ سوچ رہی تھی: ایسا لگتا ہے جیسے ساری دنیا کالی ہو گئی ہے اور اس میں صرف میں اکیلی سفید رہ گئی ہوں۔" اتنے میں اس کے منھ پر کوئی چیز ٹکرائی۔ وہ چیخ پڑی۔ بات یہ ہوئی کہ وہ ایک جھاڑی سے ٹکرا گئی تھی۔ جب اسے اطمینان ہوا تو وہ ہنستی ہوئی آگے بڑھی۔ اتنے میں اس کے پیر کیچڑ میں پھنس گئے۔ اس نے سوچا "ذرا سنبھل کر چلنا چاہیے۔ اگر میں ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ چلتی رہوں تو راستہ نہ بھولوں گی۔ ریلیں تو ہمیشہ خاص خاص مقامات تک جاتی ہیں۔ اور میں ایسی ہی جگہوں کو دیکھنا چاہتی ہوں۔"



اسی وقت بڑے زور سے بجلی چمکی۔ اس نے کانپتے ہوئے کہا، "لو اب طوفان آ رہا ہے! مجھے بھاگنے کے لیے رات بھی ملی تو کیسی بھیانک اور ڈراؤنی!" اسی وقت بارش شروع ہو گئی۔ بونیٹا نے اپنے دل کو ڈھارس دینے کی کوشش کی اور بولی، "جو کچھ ہونا تھا وہ تو اب ہو چکا۔ اندھیرا، گرج چمک اور بارش۔ شاید اب کوئی اور مصیبت نہ آئے......"

ابھی وہ جملہ بھی مکمل نہ کرنے پائی تھی کہ اتنے میں بڑے زور کا دھماکا ہوا۔ "اڈ اڑاڑادھم!" بجلی پھر کوندی اور اس کی روشنی میں اس نے دیکھا کہ پہاڑی کا ایک ٹکڑا گر کر ریلوے لائن پر آ گیا ہے۔ بونیٹا سوچنے لگی، "اگر کہیں ریل گاڑی آ گئی تو بڑا زبردست حادثہ ہو جائے گا۔ مجھے فوراً اس کی اطلاع کرنی چاہیے۔"

چناں چہ وہ دوڑتی ہوئی انٹونیو کے گھر واپس پہنچی۔ اس نے دروازے پر ٹھوکر ماری اور پھر بڑے زور سے چلائی، "نا۔ نا!" انٹونیو نے جھانک کر باہر دیکھا تو اسے بونیٹا اپنے باغیچے میں کھڑی نظر آئی۔ وہ اپنی ٹارچ لے کر بونیٹا کو پکڑنے نکلا۔ مگر جب وہ اس کے بالکل قریب پہنچ گیا اور اُسے پکڑنے لگا تو بونیٹا کُود کر دُور چلی گئی اور وہاں جا کر کھڑی ہو گئی۔ انٹونیو پھر اسے پکڑنے کے لیے بڑھا اور جیسے ہی قریب پہنچا وہ پھر بھاگ کھڑی ہوئی۔ وہ اس اندھیرے میں بکری کے پیچھے دوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کے برعکس بونیٹا اس بھاگ دوڑ سے خوب لُطف اندوز ہو رہی تھی۔ انٹونیو کو ستانے کے لیے کبھی کبھی وہ چُپکی کھڑی رہتی اور جب انٹونیو کا ہاتھ اس کی گردن تک آ جاتا تو تیزی سے بھاگ کر دُور چلی جاتی۔ اسی طرح کرتے کرتے وہ انٹونیو کو ریلوے لائن تک لے آئی، جہاں پہاڑی کا ایک ٹکڑا گر پڑا تھا اور لائن بند ہو گئی تھی۔ یہ حالت دیکھ کر انٹونیو بہت گھبرایا۔ وہ بونیٹا کو تو بھول گیا اور تیزی سے اپنے گھر پہنچا۔ وہاں سے ریلوے اسٹیشن ٹیلے فون کیا۔ بونیٹا ریلوے لائن کے کنارے کنارے آہستہ آہستہ چلتی رہی۔ پھر وہ رُک گئی اور سوچنے لگی، "مجھے اپنا ارادہ بدل دینا چاہیے۔ اب میں کہیں نہیں جاؤں گی۔ اسی فارم پر رہوں گی۔ یہاں زندگی اتنی بے مزہ نہیں ہے۔ آج رات تو میں نے اچھی خاصی ایک مُہم سر کر لی ہے!" اور بونیٹا آہستہ آہستہ چلتی ہوئی فارم میں داخل ہو گئی۔ وہ بہت خوش تھی۔ آج اُسے یہ سب کچھ نیا نیا اور اچھا اچھا لگ رہا تھا۔

عجیب طالب علم

محمد ساجد اقبال

طاروس جنوب کے شہ زور حکمراں قبیلے کا ذہین اور ہونہار بچہ تھا۔ اُسے نئے نئے علوم پڑھنے اور سیکھنے کا بہت شوق تھا۔ مگر ان کی ریاست کوہ قاف میں صرف دو مدرسے تھے۔ ایک مدرسہ عوام کے لیے اور دوسرا مدرسہ حکمراں طبقے کے لیے۔ عوامی مدرسے میں معمولی تعلیم دی جاتی تھی لیکن حکمراں طبقے کے مدرسے میں اعلا تعلیم کے علاوہ چند خاص علوم بھی سکھائے جاتے تھے، مثلاً ہر شے پر اپنی مرضی چلانا، ہوا کے دوش پر اڑنا، پلک جھپکتے، روپ بدل لینا اور نظروں سے غائب ہو جانا وغیرہ وغیرہ۔ یہ تمام علوم طاروس نے جلد ہی سیکھ لیے۔

طاروس کے دل میں سیاحت کی خواہش نے انگڑائی لی۔ اُس نے اپنے ابا حضور سے انسانوں کی دنیا میں جانے اور نئے نئے علوم سیکھ کر اپنی ریاست میں رائج کرنے کے عزم کا اظہار کیا۔ چوں کہ مقصد نیک تھا لہٰذا جلد ہی اجازت مل گئی۔ طاروس انسانی دنیا میں سب کی نظروں سے غائب مسلسل گھومتا رہا۔ کبھی کسی شہر میں جا نکلتا کبھی کسی ملک میں۔ ان شہروں میں اُس نے عجیب عجیب چیزیں دیکھیں۔ عالی شان عمارتیں، مسجدیں، ٹیکسیاں، ہوائی جہاز، سمندری جہاز، اسکول کالج، پُرفضا پارک اور بارونق ہوٹل وغیرہ۔ یہ سب دیکھ کر وہ حیران ہو رہا تھا۔ اُسے یہاں کی ہر چیز کوہ قاف کی طلسماتی زمین سے کہیں زیادہ خوب صورت، عجیب اور پُرکشش نظر آ رہی تھی۔ وہ جس شہر میں جاتا وہاں کے باشندوں کے رہن سہن اور لباس کے مطابق ہی اپنی شکل و صورت بدل لیتا۔

جب اس نے لندن کے جگمگاتے شہر میں قدم رکھا تو یہاں کی رونق اور ترقی سے بے حد متاثر ہوا۔ ٹیلے وژن، ریڈیو اور ٹیلے فون دیکھ کر وہ بہت حیران ہوا۔

ایک دِن اس نے پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھا۔ ایک رئیس کے روپ میں وہ خوب صورت تانگے میں بیٹھا شہر لاہور کے تاریخی مقامات کی سیر کر رہا تھا۔ ٹھنڈی ہوا کا لطف لیتے ہوئے اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں جیسے سو رہا ہو۔ اچانک بچوں کے شور و غل سے وہ چونک پڑا۔ دیکھا تو تانگا ایک اسکول کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ ننھے منے بچے کتابیں اُٹھائے بستے



کندھوں پر لٹکائے اسکول کے دروازے سے نکل رہے تھے۔ یہ بڑا عجیب منظر تھا۔ یہ اُسے بہت پسند آیا۔

"بس یہیں اتار دو۔" طارُوس نے کہا۔ تانگا رُک گیا۔ اُس نے تانگے سے اُتر کر پچاس کا نیا نوٹ کوچوان کو دیا۔ "میرے پاس کُھلے رُپے نہیں ہیں جناب!" کوچوان نے کہا۔

"تو کوئی بات نہیں، رکھ لو، موج اُڑاؤ۔" طاروس نے مسکرا کر کہا۔ کوچوان حیران بھی ہوا اور خوش بھی۔ اس نے جلدی سے گھوڑے پر چابک لہرائی اور تانگا آگے بڑھا دیا۔ طاروس نے اپنے خفیہ علم کے ذریعہ سے کوچوان کے گھریلو حالات معلوم کر لیے تھے۔ اُس نے اپنی بیوی کا سونے کا کڑا صرف پچاس رُپے میں ایک سود خور بنیے کے پاس گِروی رکھا تھا، جس کی قیمت چھے سو رپے تھی۔ سود در سود ہو کر اب یہ رقم تین سو رُپے ہو چکی تھی۔ اُسی دِن سُود خور نے کوچوان کو خبردار کیا تھا کہ اگر تین سو رپے فوری ادا نہیں کیے گئے تو زیور ضبط کر لیا جائے گا۔ طاروس کو یہ بھی معلوم ہوا کہ کوچوان بے حد غریب اور شریف آدمی ہے اور سخت پریشان ہے، لہٰذا طاروس نے دو ہی قدم اُٹھا کر دُور پہنچے ہوئے کوچوان کو جا لیا اور زور سے کہا "ٹھیرو۔"

کوچوان گھبرا کر فوراً رُک گیا۔ طاروس نے کہا، "آج تم کو تین سو روپے کی اشد ضرورت تھی نا؟ یہ لو اور جا کر اپنی ضرورت پوری کرو، شاباش۔" کوچوان اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا اور اس پُراسرار سیّاح کو دعائیں دیتا ہوا رخصت ہو گیا۔ اس طریقے سے کوچوان کی مدد کر کے طاروس کو بڑا سکون ملا۔

اب طاروس ایک طرف کھڑا ہو کر بچّوں کو دل چسپی سے دیکھنے لگا۔ اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ وہ بھی اتنا سا بچّہ بن کر اسکول میں داخل ہو جائے اور تعلیم حاصل کرے۔ سب بچّے جا چکے تھے۔ ہیڈ ماسٹر اور چند استاد رہ گئے تھے۔ اُس نے ایک خوب صورت طالب علم کی شکل اختیار کی اور ہیڈ ماسٹر صاحب کے سامنے جا پہنچا اور کہا، "میں اسکول میں داخلہ لینا چاہتا ہوں۔" ہیڈ ماسٹر صاحب نے پوچھا، "کون سی جماعت میں؟" طاروس گھبرا گیا لیکن پھر جلد ہی بولا، "جس جماعت میں چاہیں داخل کر لیں۔" "تم نے کتنی جماعتیں پہلے پڑھی ہیں لڑکے؟" ہیڈ ماسٹر صاحب نے دریافت کیا۔ اب طاروس کو اپنی غلطی کا احساس ہُوا۔ اُس نے گہری نظروں سے ہیڈ ماسٹر صاحب کی آنکھوں کو گھورا۔ وہ بے بس ہو گئے اور جو کچھ طاروس کہتا وہ کسی مشینی انسان کی طرح اس کی تعمیل کرتے رہے۔ طاروس کو آٹھویں جماعت میں داخل کر لیا گیا۔ یہ سب طاروس کی پُراسرار طاقت کا کرشمہ تھا۔

اگلے دن طاروس کلاس میں پہنچا۔ اس نے اپنی ذہانت اور حُسنِ سلوک سے لڑکوں کے دل جیت لیے۔ بہت سے لڑکے اس کے گہرے دوست بن گئے۔ انھوں نے بھی خلوص کا مظاہرہ کرتے ہوئے طاروس کو سب سے آگے ڈیسک پر جگہ دی۔ طاروس نے اپنی پُراسرار طاقتوں کو تعلیم حاصل کرنے میں بالکل استعمال نہیں کیا، بلکہ عام طالب علموں کی طرح سارا دن مختلف مضامین پڑھتا۔ تاریخ اس کا پسندیدہ مضمون تھا۔ جلد ہی وہ پورے اسکول میں ایک ذہین طالب علم کی حیثیت سے مشہور ہو چکا تھا۔ استاد اس سے پیار کرتے تھے، کیوں کہ وہ بڑا ملنسار، خوش اخلاق، نیک سیرت، رحم دل، محنتی اور ایمان دار تھا۔ اُستادوں کی عزت اور غریب ساتھیوں کی مدد کرنا اُس کی عادت تھی۔ وہ آوارہ، نالائق اور جھگڑالو قسم کے لڑکوں کا دشمن تھا اور اُنھیں اپنے خفیہ علم اور پوشیدہ طاقت کے ذریعہ سے سخت سزائیں دیتا تھا جس سے وہ سُدھر جاتے تھے۔ اسے کرکٹ کا کھیل بہت پسند تھا۔ جب دو ٹیمیں آمنے سامنے ہوتیں

تو وہ اپنے خفیہ علم کو استعمال کرتا۔ بالنگ کرتے وقت وہ وکٹیں توڑ دیتا اور کھلاڑی ایک دوڑ بھی نہ لگا سکتا۔ وہ ہوا میں اُچھل کر گیند پکڑ لیتا۔ اپنی خفیہ طاقت سے میچ کا پلّا کبھی ایک ٹیم کے حق میں کر دیتا تو کبھی دوسری ٹیم کے حق میں۔ جب خود بیٹنگ کرنے جاتا تو چوکے اور چھکّے سے کم ہٹ نہ لگاتا۔ وہ آسانی سے سنچری بنا لیتا۔ لوگ حیران رہ جاتے۔ اسے "مین آف دی میچ" کے انعام کا حق دار قرار دیا جاتا اور بہت سا روپیہ ملتا جو وہ غریب لڑکوں میں بانٹ دیتا یا ان کو تحفے دیتا۔

سالانہ امتحان قریب تھا۔ اس سال طاروس میٹرک کا امتحان دے رہا تھا۔ اس دن ان کا پہلا پرچہ تھا۔ طاروس نے خوب محنت کی تھی اور امتحان کے لیے پوری طرح تیار تھا لیکن بہت سے لڑکے نوٹس اور کتابیں لائے تھے اور موقع پا کر نقل کر رہے تھے۔ طاروس کو یہ



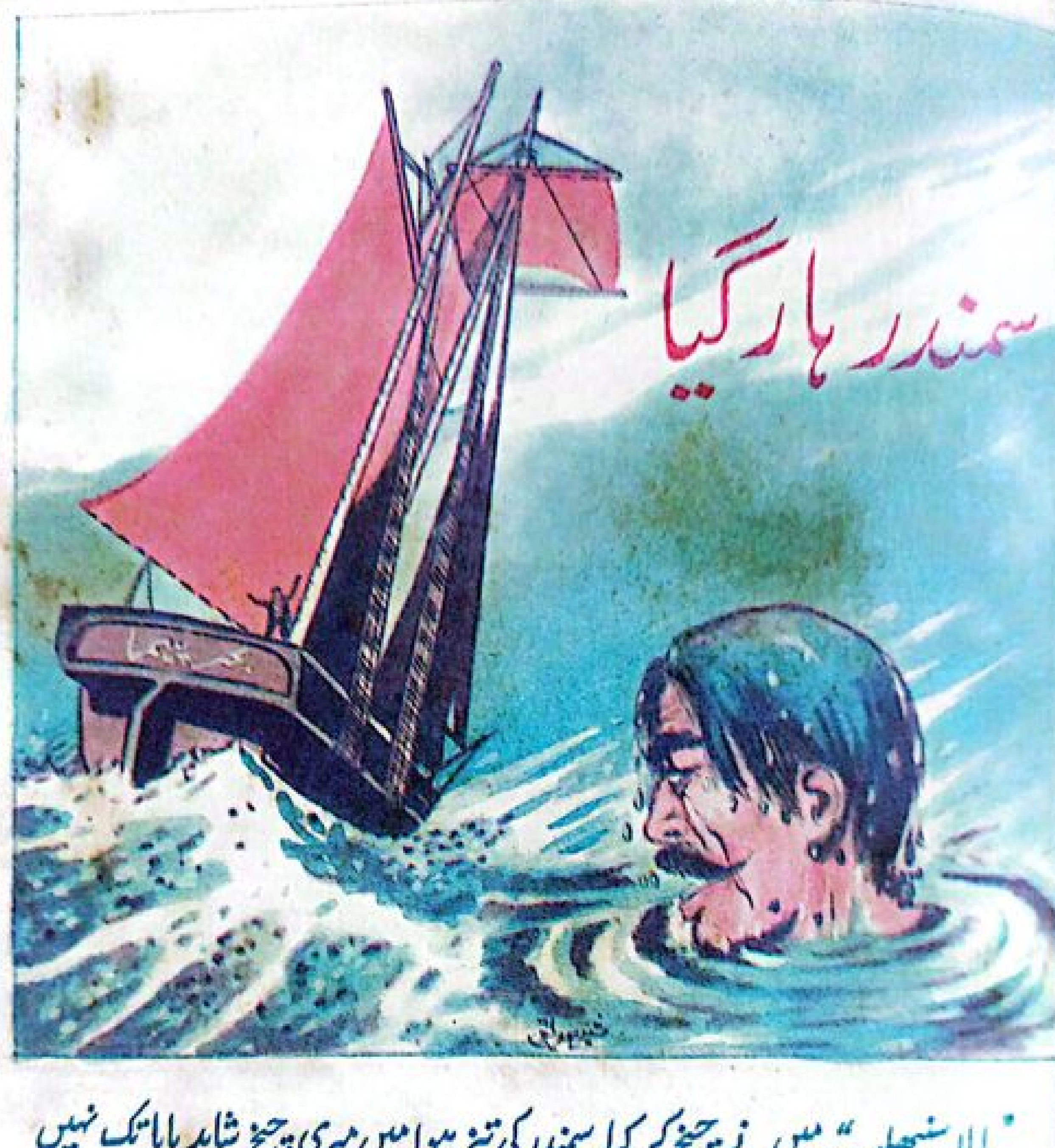
بات پسند نہ تھی، کیوں کہ یہ عادت اور اس کا نتیجہ دونوں ہی خراب تھے۔ وہ ان سب کو سزا دینا چاہتا تھا۔ طاروس نے اپنی پراسرار قوت کا مظاہرہ کیا اور تمام لڑکے جو نقل کر رہے تھے اپنے پرچے ہاتھوں میں لے کر کھڑے ہو گئے اور اپنی غلطی کا اعتراف کرنے لگے۔ نگرانی کرنے والے اساتذہ حیران تھے کہ ان طالب علموں کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔ یہاں بھی طاروس کی خفیہ طاقت نے کام کیا اور نگراں حضرات نے ان لڑکوں سے کاغذات چھین کر انھیں معاف کرتے ہوئے پرچہ حل کرنے کے لیے نئے پرچے دیے۔ اب تمام لڑکے اپنے ذہن سے پرچہ حل کرنے لگے۔

طاروس نے مڈل میں بھی پوزیشن حاصل کی تھی اور اس مرتبہ بھی میٹرک میں پورے نمبر لے کر شان دار پوزیشن حاصل کی۔ اخبارات میں اس کی تصاویر اور انٹرویو شائع ہوئے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب کی تو خوشی کی انتہا نہ تھی۔ جلسہ کا اہتمام کیا گیا۔ شہر کے بڑے بڑے لوگوں کو بھی بلایا گیا اور طاروس کو بیش قیمت انعامات دیے گئے، شاباش اور مستقبل میں مزید کام یابی کی دعا دی گئی۔ آخر میں طاروس اپنے خیالات کا اظہار بڑے وقار اور اعتماد کے ساتھ کرنے کے لیے اسٹیج پر آیا۔ سلام کر کے کہنے لگا:

"میرے بزرگو اور دوستو! مجھے جو کام یابیاں حاصل ہوئی ہیں وہ محض استادوں کے احترام، والدین کی اطاعت، بڑوں کی عزت، غریبوں اور یتیموں سے ہمدردی، لگن اور محنت سے پڑھائی اور سب کے ساتھ اچھے سلوک سے ہی نصیب ہوئی ہیں۔"

پھر اُس نے اپنے متعلق بتایا کہ وہ کون ہے اور یہاں کیوں آیا تھا۔ اور اب وہ اپنے ملک جا کر وہاں بھی تعلیم عام کرے گا۔ آخر میں طاروس نے سب کو اللہ حافظ کہا اور ہیڈ ماسٹر صاحب کے ہاتھوں کو چوم کر غائب ہو گیا۔

سمندر ہار گیا



"بابا! سنبھلیے۔" میں نے چیخ کر کہا۔ سمندر کی تیز ہوا میں میری چیخ شاید بابا تک نہیں پہنچ سکی تھی یا پھر مجھے خطرے کا احساس دلانے میں دیر ہو گئی تھی۔ میرے بابا نے جھک کر ۲۲ فیٹ لمبی کشتی کے گرد لگی ہوئی سلاخوں کو پکڑا ہی تھا کہ سمندر کی ایک بڑی لہر نے کشتی کو ترچھا کر دیا۔ میں کشتی کے پہیئے سے جھول کر رہ گیا۔ دوسری طرف میرے بابا کے پیروں کے نیچے سے کشتی نکل گئی۔ لہر کا جھٹکا اتنا زور دار تھا کہ کشتی کا جنگلہ بھی بابا کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ میرے بابا سمندر کی خوف ناک لہروں میں غائب ہو گئے۔ رنج اور خوف سے میری چیخ حلق میں پھنس کر رہ گئی۔ مجھے تو ہوش اس وقت آیا جب میں نے اپنے بابا کو لہروں میں سے سر ابھارتے دیکھ لیا۔ اس وقت مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا، جیسے میں سب کچھ بھول گیا ہوں۔ مجھے کوئی بات یاد نہیں آرہی تھی۔ وہ تمام باتیں جو بابا نے پچھلے پانچ چھے سال کے دوران مجھے سمجھائی تھیں، ان

میں سے کوئی بات بھی مجھے اس وقت یاد نہیں آرہی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اپنے بابا کو بچانے کے لیے مجھے سب سے پہلے کیا کرنا چاہیے۔ اسی عرصے میں ہماری کشتی "بحرپیما" آگے بڑھ گئی، اور میرے بابا پیچھے رہ گئے۔

بابا اور کشتی کے درمیان فاصلہ بڑھتا جارہا تھا۔ میری آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ میری نظروں کے سامنے میرے بابا ڈوب رہے تھے اور میں بے بسی سے دیکھ رہا تھا۔ پھر اچانک کسی انجانے جذبے کے تحت میں کشتی کا رُخ موڑنے والے پہیئے کی طرف مڑ گیا۔ کسی نہ کسی طرح میں نے کشتی کا رُخ موڑا۔ "بحرپیما" سامنے سے آنے والی خوف ناک لہروں میں ایک طرف مڑ گئی۔ پھر ان لہروں کے زور کی وجہ سے اور کچھ اس وجہ سے کہ میں نے کشتی کا رُخ موڑ کر ایسے رُخ پر کر دیا تھا جس کی وجہ سے کشتی آگے بڑھ ہی نہیں سکتی، دو تین جھٹکے لے کر "بحرپیما" رک گئی۔

میں کشتی کے پہیئے سے ہٹ گیا اور گھوڑے کی نال کی شکل کا پیراک پیپا بابا کی طرف پوری قوت سے پھینکا تاکہ وہ اس کا سہارا لے سکیں اور ڈوبنے سے بچ جائیں۔ لیکن یہ پیراک پیپا یا بوائے بابا سے دور رہ گیا۔ میں نے کوشش کی کہ کشتی پر کھڑے ہو کر چیزوں کو دھکیلنے یا کھینچنے والا بانس نکال کر بوائے کو آگے دھکیل دوں لیکن یہ بانس پھنسا ہوا تھا۔ میں گھبراہٹ اور خوف سے بے معنی انداز میں چیخ رہا تھا۔ بیچ سمندر میں آتا بھی کون؟ اس روز تو یوں بھی چھٹی کا دن تھا۔ بابا مجھے کشتی چلانے کی مشق کرانے کے لیے لے آئے تھے۔ ہم لوگ سمندر کے کنارے رہتے ہیں۔ ہمارا پورا خاندان ماہی گیر ہے۔ بابا مجھے بھی ایک بہترین ماہی گیر اور ملّاح بنانا چاہتے ہیں، اس لیے وہ اکثر اسی طرح صرف مجھے لے کر سمندر میں دور تک نکل جاتے ہیں۔ آج بھی وہ مجھے لے کر سمندر میں دور تک نکل آئے تھے۔

میں بانس کھینچنے کی جدوجہد میں مصروف تھا۔ اچانک مجھے ایک ہلکا سا جھٹکا لگا۔ بحرپیما پھر رینگتی ہوئی آگے بڑھنے لگی تھی۔ کشتی کو دوبارہ چلتا ہوا محسوس کر کے میری چیخوں میں اضافہ ہو گیا لیکن فوراً ہی مجھے خیال آیا کہ صرف چیخنے چلانے سے میرے بابا کی زندگی نہیں بچ سکتی۔ میں نے اپنے حواس درست کیے اور ایک مرتبہ پھر کشتی کا توازن درست رکھنے والے پہیئے کی طرف مڑا۔ کشتی کا توازن درست کرتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ کشتی کے دونوں بادبان کھلے ہوئے ہیں، ان میں

ہوا بھر جاتی ہے اور کشتی چلنے لگتی ہے۔ میں نے دونوں بادبانوں کی رسیاں کھول کر بادبان لپیٹ دیے۔ ہماری کشتی ایسی تھی جس میں موٹر بھی تھی اور دو بادبان بھی لگے ہوئے تھے۔ بادبان لپیٹنے کے بعد مجھے اطمینان ہو گیا کہ اب کشتی چاہے کسی بھی طرف مڑے اس کے بادبانوں میں ہوا نہیں بھرے گی۔ اس طرح کشتی کم از کم آگے نہیں بڑھے گی۔ بابا اور کشتی کے درمیان فاصلہ کم ہی ہو گا، بڑھے گا نہیں۔

بابا اونچی اونچی لہروں سے لڑتے ہوئے کسی نہ کسی طرح بوائے تک پہنچ ہی گئے۔ انھوں نے بوائے میں اپنا جسم پھنسا لیا تھا۔ اس طرح یہ اطمینان ہو گیا کہ اب میرے بابا سمندر میں ڈوب نہیں سکیں گے۔ بابا اب کشتی کی طرف تیرتے ہوئے آ رہے تھے۔ آخر وہ کشتی کے پاس پہنچ گئے۔ میں لپک کر کشتی کی باڑھ کے پاس پہنچ گیا تاکہ بابا کو کشتی پر چڑھنے میں مدد دے سکوں۔ اس وقت سردی کی وجہ سے بابا کا بدن کانپ رہا تھا۔ وہ جو لباس پہنے ہوئے تھے وہ بھیگ کر وزنی ہو گیا تھا۔ کم سے کم ۲۵ کیلو وزن تو بڑھ ہی گیا ہو گا۔ میں نے انھیں سنبھالنے کی کوشش کی تو میں خود بھی لڑھک کر کشتی پر گر گیا۔ اللہ کا شکر ہے کہ میں سمندر میں نہیں گرا تھا۔ مجھے گرتا دیکھ کر بابا شاید کچھ مایوس ہو گئے تھے۔ انھوں نے چیخ کر کہا:

"بے کار ہے...... بے کار ہے لطیف...... اپنی جان خطرے میں مت ڈالو۔ میں کشتی پر نہیں چڑھ سکتا...... تم واپس چلے جاؤ......"

"نہیں...... بابا نہیں...... میں آپ کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گا......" میں نے روتے ہوئے کہا اور اپنے چاروں طرف نظر ڈالی کہ شاید کوئی ایسی چیز نظر آ جائے، جس سے میں اپنے بابا کی مدد کر سکوں۔ اچانک میری نظر اس رسّے پر پڑی جو اگلے بادبان کو باندھنے کے کام آتا تھا اور جسے میں نے ابھی تھوڑی دیر پہلے کھولا تھا۔ بادبان سے کھول کر اسے میں نے یوں ہی کشتی کے فرش پر چھوڑ دیا تھا۔ سمندر کے ہچکولوں سے یہ رسّا پھسل کر پانی میں گر گیا تھا، لیکن اس کا ایک سرا چوں کہ رسّا لپیٹنے والی چرخی سے بندھا ہوا تھا، اس لیے یہ کشتی کے ساتھ پانی ہی میں تیر رہا تھا۔ میں نے بابا سے کہا کہ وہ یہ رسّا اپنے بدن سے باندھ لیں۔

بابا میرے اشارے کو سمجھ گئے۔ انھوں نے کوشش کر کے رسّا پکڑ لیا اور اسے اپنے بدن سے باندھنے لگے۔ ادھر میں نے رسّا لپیٹنے والی چرخی کو ٹھیک کیا۔ رسّی کا دوسرا سرا اچھی طرح چرخی پر چڑھا

دیا، چرخی کا نالا درست کیا تاکہ چرخی جتنی لپٹ جائے وہ دوبارہ نہ کھل سکے۔ پھر میں نے چرخی کا دستہ سنبھال لیا۔ بابا نے جب اپنے گرد رسّے کو اچھی طرح باندھ لیا تو میں نے چرخی چلانی شروع کی۔ ایک مرتبہ میں مجھ سے چند انچ سے زیادہ رسّا نہیں لپیٹا جا سکا، پھر بھی میں نے اپنی کوشش جاری رکھی۔ آہستہ آہستہ بابا پانی سے باہر نکلنے لگے۔ یہاں تک کہ وہ عرشے پر لگے ہوئے ڈنڈوں کو پکڑنے میں کام یاب ہو گئے۔ اسی وقت ایک اونچی لہر آئی جس نے کشتی کو دوسری طرف جھکا دیا لیکن اس وقت تک بابا چوں کہ ڈنڈوں کو مضبوطی سے پکڑ چکے تھے، اس لیے یہ لہر کوئی نقصان پہنچانے کے بجائے فائدہ مند ہی ثابت ہوئی ۔ بابا عرشے پر آ گئے۔

بابا کے عرشے پر پہنچ جانے سے مجھے خوشی تو ہوئی تھی لیکن خوشی ظاہر کرنے کا مجھے ہوش کہاں تھا! میں دوڑ کر بابا سے لپٹ گیا۔ میرے بابا کو نئی زندگی جو ملی تھی! بابا نے بھی مجھے چمٹا لیا۔ بڑی دیر تک ہم دونوں باپ بیٹے ایک دوسرے سے لپٹے رہے۔ پھر بابا کپڑے بدلنے کے لیے نیچے چلے گئے۔ میں نے کوشش کر کے کشتی کا انجن دوبارہ چلا دیا۔

واپسی کے سفر میں میں نے بادبان نہیں کھولے تھے۔ جب ہم گودی کے قریب پہنچنے والے تھے تو بابا اوپر آ گئے۔ انھوں نے بڑے پیار سے میرے کندھوں پر ہاتھ رکھا۔ اس وقت مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے زبان سے ایک لفظ کہے بغیر میری تعریف کر رہے ہوں کہ وہ مجھے جو کچھ سکھانا چاہتے تھے وہ میں نے بڑی جلدی سیکھ لیا۔ اس احساس سے مجھے کتنی خوشی ہوئی اسے میں بیان نہیں کر سکتا۔ خوشی کی بات بھی تھی۔ سمندر نے میرے بابا کو مجھ سے چھیننا چاہا تھا لیکن میں نے اتنے بڑے سمندر سے تنہا جنگ کی تھی۔ میں اپنے بابا کو اپنے ساتھ لے جا رہا تھا۔ میری عمر ابھی زیادہ نہیں لیکن بابا کی سکھائی ہوئی باتوں اور ہمّت سے میں نے اتنے بڑے سمندر کو ہرایا تھا۔ میں نے بابا کی طرف دیکھ کر پوچھا:

"بابا! ہم کل بھی سمندر میں چلیں گے؟"

"ہاں، ہاں، کیوں نہیں۔ کل تو ہم زیادہ دور تک جائیں گے اور بہت زیادہ مچھلیاں بھی پکڑیں گے۔" بابا نے ایک بار پھر مجھے چمٹا لیا۔

علامہ دانش کے سفرنامے

بھوتوں کی بستی

معراج



علامہ دانش ان دنوں بھوتوں کے متعلق تحقیقات کر رہے تھے۔ اتفاق سے ان ہی دنوں اوسٹریلیا کے اخباروں میں ایک دل چسپ خبر شائع ہوئی۔ وہاں ایک ویران بستی پر بھوتوں نے ڈیرا جما رکھا تھا۔ اس کی تصدیق کئی لوگوں نے کی تھی۔ علامہ نے ہمیں ایک اخبار کا تراشہ پڑھنے کے لیے دیا۔ اس میں یوں لکھا تھا:

بھوتوں کی بستی

جنوبی اوسٹریلیا میں دریائے کوپر کے کنارے ایک بستی جارج ٹاؤن آباد تھی۔ دریا کے دونوں طرف بہت اونچے اونچے درخت تھے اور اس کی وادی بے حد سرسبز اور شاداب تھی۔ لوگوں نے وہاں مویشیوں کے فارم قائم کر رکھے تھے۔ بدقسمتی سے دریا نے اپنا راستہ تبدیل کر لیا۔ اس کے کنارے بسنے والے گاؤں جارج ٹاؤن کے لوگ پانی کی تلاش میں اپنے گھر بار چھوڑ کر دوسری جگہوں پر منتقل ہونے لگے۔ کچھ ہی دنوں بعد یہ بستی بالکل ویران ہو کر رہ گئی۔ جو جانور وہاں باقی

رہ گئے تھے۔ وہ پانی کی تلاش میں اِدھر اُدھر مارے مارے پھرتے رہے۔ آخر بھوک پیاس سے وہیں مر گئے۔ ہزاروں جانوروں کے ڈھانچے وہاں بکھرے پڑے ہیں۔ ایک خشک تالاب کے اِرد گرد سیکڑوں جانوروں کے ڈھانچے پڑے ہوئے ہیں۔ وہ پیاس سے مر گئے تھے۔ ان کا گوشت تو کب کا گل سڑ چکا تھا۔ صرف ہڈیوں کے ڈھانچے اور چمڑا رہ گیا ہے۔

بعض مکانات مٹی میں دفن ہو چکے ہیں، بعض گر چکے ہیں لیکن کچھ مکانات ابھی تک بالکل صحیح سالم حالت میں موجود ہیں۔ ان کے رہنے والے جو میز، کرسیاں، کتابیں، کپڑے اور دوسری چیزیں جس طرح چھوڑ کر گئے تھے وہ جوں کی توں موجود ہیں۔ پہلے ان مکانات میں انسان رہتے بستے تھے، مگر اب وہاں چوہوں، اُلّوؤں اور پہاڑی کوّوں کا بسیرا ہے۔ غرض پورا ماحول بے حد دہشتناک ہے۔ کچھ عرصے بعد یہ افواہ سنی گئی کہ یہاں بھوتوں نے اپنا ڈیرا جما لیا ہے۔ یہ بھی سننے میں آیا کہ یہ بھوت چیختے چلّاتے ہیں اور انسانوں کی طرح بولتے ہیں۔

کچھ عرصے قبل ایک سفید فام (گورا) شخص سونے چاندی کی تلاش میں اس بستی میں پہنچا۔ کچھ دنوں بعد وہ گرتا پڑتا واپس ایک آبادی میں پہنچا۔ وہ ڈر کے مارے پاگل سا ہو رہا تھا۔ اس نے بہت مشکل سے بھوتوں کے متعلق کچھ بتایا۔ وہ کچھ عرصے بخار میں مبتلا رہ کر چل بسا۔

اس کا افسر بہت دلیر آدمی تھا۔ وہ اس بات کی تصدیق کرنے کے لیے وہاں گیا۔ اس کا بھی بھوتوں سے واسطہ پڑا۔ بھوتوں نے اسے اتنا ڈرا دیا کہ وہ بہت دن تک بیمار رہا۔ آخر وہ اپنی ملازمت چھوڑ کر انگلستان چلا گیا۔

ہمارے اخباری نمائندوں کی ایک جماعت اس خبر کی سچائی معلوم کرنے کے لیے جارج ٹاؤن پہنچی۔ وہاں کا ماحول بے حد دہشت ناک ہے۔ دن کے وقت تو وہاں بالکل سناٹا طاری رہتا ہے۔ انھوں نے رات کے وقت بھوتوں کے چیخنے چلّانے کی آوازیں سنیں۔ وہ بھی دہشت زدہ ہو کر وہاں سے واپس لوٹے۔ میں نے اخبار علّامہ کو واپس دے دیا۔

علّامہ نے اخبار کو اپنے بیگ میں رکھا اور بولے، "میرا ارادہ ہے کہ اوسٹریلیا جاؤں اور خود ان بھوتوں کے متعلق تحقیقات کروں۔"

اگلے ہفتے ہم اوسٹریلیا پہنچے۔ جو کچھ اخبار میں لکھا ہوا تھا، وہ حرف بہ حرف درست نکلا۔ ویران اور غیر آباد مکانات دیکھ دیکھ کر وحشت ہونے لگی۔ جگہ جگہ ہڈیوں کے ڈھیر اور ڈھانچے دیکھ دیکھ کر

طبیعت اور بھی زیادہ پریشان ہوئی۔ میں نے وہ تالاب بھی دیکھا، جس کے پاس سینکڑوں جانور بھوک پیاس سے مر گئے تھے اور ان کے ڈھانچے ابھی تک پڑے ہوئے تھے۔

دن کا وقت تو جیسے تیسے گزر گیا۔ رات آئی تو ڈر کے مارے میری بُری حالت تھی۔ کپتان مرشد نے پوچھا، "کیا بھوتوں کو دیکھنے کے لیے نہیں چلوگے؟"

میں نے کپکپاتی ہوئی آواز میں کہا، "مجھے معاف ہی رکھیے۔ مجھے بھوتوں سے ملنے کا کوئی شوق نہیں۔"

جب مرشد، آرزونا اور علّامہ دانش چلے گئے تو اور بھی زیادہ دہشت محسوس ہونے لگی۔ میں جہاز سے باہر نکلا، سوکھی جھاڑیاں اور گھاس پھونس اکٹھی کی اور چائے بنانے لگا۔ کچھ دیر بعد جب میں چائے پی رہا تھا تو کسی نے بہت آہستہ سے لیکن صاف اور واضح آواز میں کہا، "وہ سب مر گئے۔"

میرا رُواں رُواں خوف سے کھڑا ہو گیا۔ میں نے وہاں سے بھاگ جانا چاہا لیکن میرے پاؤں تو مَن مَن بھر کے ہو گئے تھے۔

پھر کسی نے بہت دردناک آواز کہا، "پانی، پانی، اللہ کے لیے مجھے پانی پلادو۔"

جواب میں کوئی قہقہہ مار کر ہنسا۔ پھر کسی نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا، "آہ، وہ سب مر گئے۔ مر گئے۔ مر گئے۔"

میں نے اِدھر اُدھر دیکھا لیکن وہاں کوئی بھی تو نہیں تھا۔ پھر کسی نے میرے سر کے بالکل اوپر چیخ مار کر کہا، "ہائے! سب مر گئے۔ مر گئے۔"

میں نے اوپر نگاہ ڈالی، وہاں بھی کوئی نہیں تھا۔ دور آسمان پر ستارے ٹمٹما رہے تھے۔

مجھے پاگل بنانے کے لیے یہ بہت کافی تھا۔ میں نے خوف اور دہشت سے ایک چیخ ماری اور اپنے ساتھیوں کی تلاش میں دیوانوں کی طرح دوڑا۔ میں نے پوری قوت سے آواز دی، "تم کہاں ہو؟ مرشد، آرزونا، علامہ!"

کسی نے بہت قریب سے جواب دیا، "مر گئے۔ سب مر گئے۔ مر گئے۔" پھر کوئی سسکیاں لے لے کر رونے لگا۔ میں کم زور اعصاب کا وہمی آدمی نہیں ہوں لیکن اس وقت خوف اور دہشت سے میرا حال بہت بُرا تھا۔ میں مدد کے لیے چیختا چلّاتا ہوا دوڑتا چلا گیا۔ راستے میں میں ان جانوروں کے ڈھانچوں سے ٹکرا گیا جو تالاب کے کنارے پڑے تھے۔ میں تالاب میں جا گرا اور بہت سے ڈھانچے

میرے اوپر آ گرے۔ گرتے وقت میرے منھ سے ایک زوردار چیخ نکلی۔ اس کے بعد میں بے ہوش ہوگیا۔

جب مجھے ہوش آیا تو میرے سب ساتھی میرے پاس موجود تھے۔ انھوں نے ہی مجھے تالاب سے نکالا تھا۔ میں نے مختصر لفظوں میں اپنی کہانی سنا دی۔ مرشد ہنس کر بولا، "یہ سب تمھارا وہم ہے۔ ہم بھی یہاں بہت دیر سے گھوم پھر رہے ہیں، ہمیں تو کوئی بھوت ملا نہیں۔" اس کی تسلی آمیز باتوں سے میرے دل کو بھی ڈھارس ہوئی۔ میں نے کہا، "تم سب میرے ساتھ چلو۔ پھر خود ہی تمھیں معلوم ہو جائے گا کہ میں سچ کہتا ہوں یا جھوٹ؟"

ہم اس جگہ پہنچے جہاں میں نے چائے بنائی تھی۔ اچانک کسی نے بہت گھٹی گھٹی ہوئی آواز میں کہا، "پانی، پانی، مجھے تھوڑا سا پانی پلا دو۔" کوئی سامنے کے مکان سے قہقہہ مار کر ہنسا۔ پھر کسی نے چیخ ماری اور دردناک آواز میں کہا، "سب مر گئے، آہ مر گئے! مر گئے۔"

ہمارا افریقی ملازم تو اچانک ہی بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ وہ بے چارہ بہت دیر سے بڑی ہمت کا مظاہرہ کر رہا تھا لیکن بھوتوں کی چیخ و پکار کی تاب نہ لا سکا۔ میں اس کی تیمار داری میں مصروف ہوگیا۔ کافی دیر کے بعد اسے ہوش آیا۔ مرشد تعجب سے بولا، "یہ بات تو بہت عجیب ہے!"

وہ جلدی سے جہاز میں گھس گیا اور وہاں سے بارہ بور کی رائفل اٹھا کر لایا۔ علامہ تیزی سے بولے، "تم کیا کرنا چاہتے ہو؟"

مرشد بولا، "میں صرف یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ درجن بھر گولیاں کھا کر بھوت کیا کہتے ہیں؟"

علامہ بولے، "بے وقوف مت بنو، بھوتوں پر ان گولیوں کا کچھ اثر نہیں ہوگا۔"

مرشد بولا، "یہ بھی دیکھا جائے گا۔"

کسی نے اسی وقت عین ہمارے سر کے اوپر سے چلا کر کہا، "مر گئے، آہ سب مر گئے۔" کپتان مرشد آواز کی سمت میں اندھا دھند گولیاں چلانے لگا۔

کسی نے بڑی خوف ناک چیخ ماری لیکن بھوت کا نام و نشان تک نظر نہیں آیا۔ میرے جسم پر ٹھنڈے پسینے کی دھاریں بہنے لگیں۔

کپتان مرشد نے کہا، "میں بھوتوں کو دیکھے بغیر واپس نہیں جاؤں گا۔"

اس نے اپنی بندوق میں گولیاں بھریں اور گاؤں کی طرف چلا۔ میں مرشد کے ساتھ ساتھ ہی رہا۔ راستے میں وہی دہشت ناک آوازیں سنائی دیتی رہیں۔ کبھی کوئی نزدیک سے بولتا، کبھی



آوازیں دور سے آتیں۔ کبھی یوں لگتا کہ جیسے بدروحیں ہر طرف منڈلاتی پھر رہی ہوں۔ آخر ہم ان ٹوٹے پھوٹے مکانات تک جا پہنچے۔ کپتان مرشد نے ٹارچ کی روشنی میں ایک مکان کے اندر دیکھا۔ وہاں پر تو ہے، چمگادڑیں اور مکڑیوں کے جالوں کے سوا کچھ بھی تو نہیں تھا۔ علامہ دانش بولے،

"تم نے روشنی کر کے بھوتوں کو بھگا دیا ہے۔ اب ذرا اس ٹارچ کو تھوڑی دیر کے لیے بجھا دو۔"

کپتان مرشد نے علّامہ کی ہدایت پر عمل کیا اور ٹارچ بجھا دی۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اندھیرے میں مجھے بہت ڈر لگ رہا تھا۔

کوئی پانچ منٹ بعد ہمارے قریب ہی کوئی قہقہہ مار کر ہنسا۔ کپتان مرشد نے اسی سمت میں ٹارچ سے روشنی پھینکی لیکن افسوس ذرا سی دیر ہو گئی تھی۔ ایک سایہ سا ہوا میں تیرتا ہوا کھڑکی سے باہر نکل گیا۔ مرشد نے فوراً اس طرف ایک فائر داغ دیا۔ باہر سے بہت سی چیخیں اور شور سنائی دیا۔ شاید بھوت ہماری بے بسی کا مذاق اڑا رہے تھے۔

میں نے آہستہ سے کہا، "میرا خیال ہے کہ بہت ہو چکا ہے۔ اب ان بھوتوں کا پیچھا چھوڑ دو واپس چلو۔"

علامہ بھی میرے ہم خیال تھے۔ لیکن کپتان مرشد بہت عزم سے بولا، "واہ جی، اتنا رُپیہ پیسہ خرچ کر کے ہم ان بھوتوں سے ملنے کے لیے آئے ہیں۔ تم میں سے جو کوئی جانا چاہے، وہ بہت شوق سے واپس جائے۔ میں تو ان بھوتوں سے ملے بغیر واپس نہیں جاؤں گا۔"

علامہ دانش نے کئی دفعہ بڑبڑاتے ہوئے کہا، "کہ یہ سب کیا اسرار (راز) ہے؟"

مرشد نے مجھ سے کہا، "تم یہ ٹارچ سنبھال کر آگے آگے چلو۔"

میری تو جیسے جان ہی نکل گئی لیکن مجھے کپتان مرشد کا حکم ماننا پڑا۔ ہم ایک کمرے میں پہنچے۔ وہاں پیانو رکھا ہوا تھا۔ جوں ہی میں نے کمرے میں قدم رکھنا چاہا۔ کوئی چیز بہت تیزی سے باہر کی طرف نکلی۔ اس نے بہت زور سے میرے منھ پر چانٹا مارا، میں لڑکھڑا کر گرا اور ساتھ ہی ٹارچ میرے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گری۔

مرشد نے جلدی سے ٹارچ اُٹھا کر اس کی روشنی میرے اوپر پھینکی اور پوچھا، "یہ کیا چیز تھی؟" میں نے ہکلاتے ہوئے کہا، "میں خود نہیں جانتا، بس اتنا ضرور ہوا کہ کسی نے بہت زور سے میرے منھ پر چانٹا مارا ہے۔"

میں نے محسوس کیا کہ میرا چہرا گیلا ہو رہا ہے۔ علامہ دانش نے ٹارچ کی روشنی میں میرا چہرہ دیکھا اور بولے، "ارے تمھارے منھ پر تو خون لگا ہوا ہے۔" مرشد نے جلدی جلدی کپڑے سے میرا منھ پونچھا۔ سب سے زیادہ دل چسپ بات یہ ہے کہ میرے چہرے پر کوئی زخم نہیں آیا تھا۔

ہم نے کمرے میں قدم رکھا تو ہماری نظریں خون میں لت پت چوہے پر پڑیں۔

وہ مسکرا کر بولا، "ایک بات تو معلوم ہو گئی۔ وہ یہ کہ تمھارے چہرے پر جو خون لگا ہوا تھا وہ اس چوہے کا تھا۔"

پھر وہ علامہ سے مخاطب ہوا، "علامہ صاحب! کیا بھوت چوہے بھی کھاتے ہیں؟" علامہ دانش جھنجھلا کر بولے، "ارے بھئی! مجھے کیا معلوم کہ بھوت کیا کھاتے ہیں اور کیا نہیں کھاتے! مجھے آج تک کسی بھوت سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا۔"

کپتان مرشد ہنس کر بولا، "کیا آپ بھوت سے ملنا پسند فرمائیں گے؟"

مجھے محسوس ہوا کہ کپتان مرشد بھوتوں کی حقیقت جان چکے ہیں۔ مرشد نے کہا، "ذرا ایک منٹ ٹھیریے۔" پھر اس نے ٹارچ میرے ہاتھ میں تھما دی اور بولا، "جوں ہی میں آواز دوں تم ٹارچ کی روشنی چوہے پر پھینکنا۔

دیکھو، ایک منٹ کی تاخیر بھی کام بگاڑ سکتی ہے۔ بھوت ہاتھ سے نکل جائے گا اور ہم دیکھتے رہ جائیں گے۔"
اب پھر انتظار کا دور شروع ہوا۔ تقریباً آدھے گھنٹے تک ہم دم سادھے کھڑے رہے۔ اچانک مرشد نے آواز دی، "ٹارچ جلاؤ۔ جلدی!"
میں نے ٹارچ کی روشنی مُردہ چوہے پر پھینکی۔ دھائیں، مرشد کی بندوق سے گونج دار آواز نکلی۔ ہم دوڑتے ہوئے مکان سے باہر نکلے۔ وہاں مُردہ چوہے کے برابر ایک پہاڑی کوّا پڑا تھا۔
علامہ ہنس کر بولے، "تم بھوت کو مارنے گئے تھے یا پہاڑی کوّے کو؟"
مرشد طنزیہ لہجے میں بولا، "اجی قبلہ، میں نے بھوت پر گولی چلائی تھی اور آپ کا بھوت یہی ہے۔"
میں نے کہا، "اب تم پہیلیاں تو نہ بجھواؤ۔ مجھے تو تمھاری باتوں سے الجھن سی ہونے لگی ہے۔"
کپتان مرشد ہنس کر بولا، "ارے بھولے بادشاہ! یہی تو وہ بھوت ہے، جس سے ڈر کر تم بے ہوش ہو گئے تھے۔ کیا تم نے پہاڑی کوّوں کو بولتے نہیں سنا ہے؟" سدھائے ہوئے پہاڑی کوّے توتوں سے زیادہ بہتر اور صاف بول سکتے ہیں۔"
اب ساری بات صاف ہو گئی تھی۔ ہم اپنی حماقتوں پر دل کھول کر ہنسے۔ علامہ دانش قہقہہ لگا کر بولے، "کھودا پہاڑ اور نکلا چوہا۔"
جب ہم جہاز پر پہنچے اس وقت بھی قہقہے لگا رہے تھے۔ آزونا ہمارا حال دیکھ کر بہت فکر مند ہوا۔ وہ سمجھا کہ ہم سب پاگل ہو گئے ہیں۔ اپنی ہنسی پر بہت مشکل سے قابو پا کر مرشد نے آزونا کو سب بات بتا دی۔ وہ بھی بھوتوں کی حقیقت جان کر قہقہے لگانے لگا۔ وہ جہاز کے کیبن میں گیا اور چائے بنا کر لایا۔ کافی دیر بعد ہماری ہنسی اور قہقہوں کا طوفان تھما۔
علامہ بولے، "کھودا پہاڑ اور نکلا چوہا۔ جسے ہم بے حد پُر اسرار راز سمجھتے تھے حقیقت میں کچھ بھی نہ تھا۔ البتہ کچھ باتیں میری سمجھ میں بھی نہیں آئیں۔ پہاڑی کوّا دن کا جانور ہے۔ اس میں اس طرح اُلوؤں اور چمگادڑوں کی طرح رات کو دیکھنے اور دن میں اندھے پن کی خاصیت پیدا ہو گئی؟ ممکن ہے کہ کبھی کوئی سائنس داں اس راز پر سے پردہ اٹھا دے۔" اگلے دن ہم ان پہاڑی کوّوں کی تلاش میں نکلے۔ اندھیرے کونوں کھدروں میں ہم نے بہت سے کوّوں کو اونگھتے ہوئے دیکھا۔ ہم نے تین کوّوں کو پکڑ کر روشنی میں لا کر چھوڑ دیا۔ ان کی آنکھیں روشنی میں چندھیا گئیں اور وہ

اندھوں کی طرح ہو گئے۔

علامہ نے کہا، "جب لوگ یہاں آباد ہوئے اور بستیاں بنا کر رہنے لگے تو وہ لوگ یہ کوّے بھی اپنے ساتھ لائے ہوں گے۔ کچھ کوّے لوگوں نے اپنے گھروں میں پال رکھے تھے۔ یہ توتوں کی طرح انسانی آواز کی نقل اُتار سکتے ہیں اور بہت جلدی بولنا سیکھ جاتے ہیں۔ جب دریا سے کو پر خشک ہو گیا تو لوگ یہاں سے ہجرت کر گئے۔ شاید دو تین لوگ یہاں کسی وجہ سے رہ گئے۔ وہ پیاس سے مرنے لگے تو کسی نے پکارا، "پانی۔ پانی، اللہ کے واسطے مجھے پانی پلا دو"۔ کوئی اور شخص سب لوگوں کی تباہی پر سسکیاں بھر کر رویا اور بولا ہو گا، "مر گئے۔ آہ مر گئے، سب مر گئے۔

اب اتفاق دیکھیے کہ ان کوّوں نے یہ آخری الفاظ یاد کر لیے۔ وہ یہی لفظ بار بار دہراتے رہے۔ پھر انھوں نے انڈے دیے۔ ان سے بچے نکلے، انھوں نے بھی یہ سبق یاد کر لیا۔ اس طرح ہوتے ہوتے پہاڑی کوّوں کی ساری آبادی ان الفاظ کی نقل کرنے لگی۔ ان کوّوں کو ان باتوں کا مطلب تو معلوم نہیں تھا، مگر جس سفید فام شخص نے انھیں سنا، اس کے حواس گم ہو گئے۔ یہی حال اس کے افسر کا ہوا۔"

کپتان مرشد قہقہہ لگا کر بولا، "اور یہی حال تمھارا ہوا۔ آرزو تا تو خیر سے ہے ہی وہمی۔"

میں نے جھینپ کر کہا، "مجھ ہی پر کیا موقوف ہے، یہاں تو بڑے بڑے پہلوانوں کا پتّا پانی ہو جاتا ہے۔"

یوں علامہ دانش کی ہر بات کی تہ تک پہنچنے کی عادت اور مُرشد کی بہادری کے سبب یہ راز سب پر ظاہر ہو گیا۔

کششِ ثقل!

مرسلہ: عامر منصور، کراچی

کششِ ثقل نیوٹن نے دریافت کی تھی غالباً اس سے پہلے نہیں ہوئی تھی۔ نیوٹن اس سے درختوں سے سیب گرایا کرتا تھا۔ آج کل سیڑھی پر چڑھ کر توڑ لیتے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ کوئی شخص حکومت کی کرسی پر بیٹھ جائے تو اس کے لیے اٹھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ لوگ زبردستی اُٹھاتے ہیں۔ یہ کششِ ثقل کے باعث ہے۔

(ابنِ انشا)